

دو مقامات کا سفرنامہ

حکایتِ مہر و وفا



○ حجاز مقدس کی والہانہ حاضری
○ دارالعلوم دیوبند کا نیاز مندانشرف

تالیف

مفتی عبدالرؤف غزنوی

فاضل و سابق استاذ و خطیب دارالعلوم دیوبند (انڈیا)
استاذ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ غزنوی کراچی

0317-7034000 0333-2114000

دو مقامات کا سفرنامہ

حکایت مہر و وفا

○ حجازِ مقدّس کی والہانہ حاضری
○ دآزلعلوم دیوبند کا نیاز مندانه شفر

تاليف

مفتی عبد الرؤف غزنوی

فاضل وسابق استاذ و خطیب دآزلعلوم دیوبند (انڈیا)
استاذ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ غزنوی کراچی

جملہ حقوق طباعت محفوظ ہیں

نام کتاب ._____ حکایت مہر و وفا
مؤلف ._____ مفتی عبدالرؤف غزنوی
اشاعت اول ._____ 2017ء - ۱۴۳۸ھ
ناشر ._____ مکتبہ غزنوی، سلام کتب مارکیٹ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
فون ._____ 0333-2114000
0317-7034000
قانونی مشیر ._____ خواجہ سیف الاسلام ایڈوکیٹ ہائی کورٹ سندھ

ملنے کے دیگر پتے

اسلامی کتب خانہ، بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ حبیبیہ، ہواڑی بازار، بونیر

مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ

وحیدی کتب خانہ، پشاور

مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ، لاہور

مکتبہ عثمانیہ، راولپنڈی

خواهی که روشنت شود احوالِ سِرِّ عشق
از شمعِ پرسِ قصّه زباده صباِ مپرس

ما قصّه سکندر و دارا نخوانده ایم
از ما بجز حکایتِ مهر و وفا مپرس

(حافظ شیرازی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

الحمد لله وحده ، والصَّلوة والسلام على من لا نبی بعده ، وبعْدُ:

سفر کرنا ایک بامشقت کام ہے، اس لئے کہ ہر ذی شعور انسان اپنے مزاج اور اپنے دستیاب وسائل کے مطابق زندگی گزارنے کا ایک طریقہ کار وضع کر لیتا ہے، جس میں وہ اپنی دینی ضروریات، دنیوی ضروریات، بال بچوں اور رشتہ داروں کے حقوق اور اپنے مشاغل و دلچسپی کے امور کو مد نظر رکھ کر ایک نظام الاوقات بناتا ہے اور اسی نظام کے مطابق چلنے میں وہ سہولت و اطمینان محسوس کر لیتا ہے، یہاں تک کہ اس کا بنایا ہوا نظام الاوقات اس کے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے۔ البتہ یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ نظام الاوقات بنانا اور اسی کے مطابق روز و شب گزارنا اس وقت ممکن ہوتا ہے کہ انسان ایک ہی ماحول میں مقیم اور اپنے مزاج کے مطابق اپنی ضروریات کو ترتیب دینے کا اختیار رکھتا ہو۔ سفر کے اندر نہ تو اپنے تمام متعلقہ امور کو انسان اپنے منہ کے مطابق چلا سکتا ہے اور نہ ہی اپنی ضروریات کو اپنے مزاج کے مطابق ترتیب دینے کی سہولت اُسے حاصل ہوتی ہے۔

نا آشنا ماحول اور ناواقف لوگوں کے درمیان سفر کرنے والے مسافر کو جو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس سے تو ہر شخص واقف ہے! ایک معزز

مہمان کی حیثیت سے بلایا گیا مسافر جس کی سہولت کی خاطر میزبانوں نے اپنے حساب سے ہر ممکن انتظام کر لیا ہو وہ بھی اُن تمام انتظامات کے باوجود سفر میں مشقت محسوس کرتا ہے، مثال کے طور پر میزبانوں نے اس کے آرام کے لئے اے۔سی والے کمرے اور اس کے اندر ایک قیمتی چار پائی پر بچھے ہوئے موٹے گدے کا انتظام کیا ہو! لیکن مسافر کو اپنے مزاج کے مطابق اے۔سی سے زیادہ پنکھا اور پنکھے سے زیادہ قدرتی ہوا پسند ہو! اور اسی طرح اُسے چار پائی پر بچھے ہوئے موٹے گدے سے زمیں پر بچھی ہوئی چٹائی یا معمولی ہلکے گدے میں زیادہ راحت محسوس ہوتی ہو، لیکن کمرے میں نہ پنکھا ہو، نہ قدرتی ہوا کا صحیح نظام اور نہ ہی زمیں پر سونے کی سہولت! اسی طرح مسافر کو سادے کھانے کی عادت بن چکی ہو لیکن میزبانوں نے اکرام کے طور پر اس کے لئے پُر تکلف مرغین کھانوں کا انتظام کیا ہو، جن کے درمیان مسافر کے مزاج کے مطابق کوئی ایک سادی چیز بھی موجود نہ ہو! مذکورہ صورتِ حال کے اندر تمام انتظامات کے باوجود بھی مسافر کو مشقت سے گزرنا پڑتا ہے، جس کا اظہار کرنا میزبانوں کے سامنے تو وہ مناسب نہیں سمجھتا، بلکہ ان کی دلجوئی کے لئے شکریہ کے الفاظ ادا کرتا ہے، البتہ دل دل میں مشقت ضرور محسوس کرتا ہے۔

سفر کی گونا گوں مشقتوں کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے مسافر کے لئے نماز کے اندر قصر کرنے کا حکم اور رمضان المبارک کے روزوں کو مؤخر کرنے کی اجازت دی ہے، اور نبی کریم ﷺ نے بھی سفر کی مشقتوں کا ذکر فرماتے ہوئے مسافر کو اپنی حاجت پوری کرنے کے بعد جلد از جلد اپنے وطن واپس لوٹنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ

فرماتے ہیں:

”السفر قطعة من العذاب يمنع أحدكم طعامه وشرابه ونومه فاذا قضى نهمته فليعجل إلى أهله“

(رواہ البخاری ۲۴۲/۱)

یعنی ”سفر عذاب کا ایک حصہ ہے، وہ تمہیں کھانے، پینے اور سونے سے روکتا ہے، لہذا جب کوئی اپنی حاجت پوری کر لے تو اپنے گھر والوں کے پاس واپسی میں جلدی کرے۔“

احقر بچپن ہی سے کچھ تو اپنی فطرت و مزاج کی بنیاد پر اور زیادہ اپنے والدین اور پھر اپنے مشفق اساتذہ کرام کی تربیت کی برکت سے ایک منظم طرزِ زندگی اختیار کرنے اور نظامِ الاوقات کے تحت چلنے کا عادی رہا ہے، اسی وجہ سے سفر سے طبعی طور پر کبھی مانوس نہیں رہا، تاہم کچھ اسفار مسلمان کی زندگی میں ضروری اور اہم بھی ہوتے ہیں، جیسے صاحبِ استطاعت مسلمان کے حق میں حج بیت اللہ کا سفر، یا طالب علم کے حق میں طلب علم کے لئے سفر اور اسی طرح بعض دیگر اہم اسفار! چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ”وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مِنْ اسْتِطَاعٍ اِلَيْهِ سَبِيْلًا“ فرما کر صاحبِ استطاعت عاقل بالغ مسلمان کے ذمہ زندگی میں ایک مرتبہ بیت اللہ کے سفر کو فرض کر دیا، اور طلب علم کے لئے سفر کی اہمیت کو واضح فرماتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام سے استفادہ کرنے کی نیت سے سفر کرنے کا قصہ سورہ کہف میں بیان فرمایا، اسی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح البخاری میں ”کتاب العلم“ کے اندر ”باب الخروج في طلب العلم“ کا عنوان قائم کر کے اس کے تحت جہاں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علمی سفر سے متعلق روایت ذکر کی ہے وہاں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کے اس تاریخی واقعہ کا تذکرہ بھی کیا ہے، جس کے مطابق انہوں نے حضرت عبد اللہ بن اُنیسؓ سے صرف ایک ہی حدیثِ نبوی براہ راست سننے کے لئے مدینہ منورہ سے سرزمینِ شام تک پورے ایک مہینے کا سفر کیا تھا۔

ایسی ضرورتوں کے تحت احقر نے بھی اپنی زندگی میں چند محدود اسفار کئے ہیں، جن میں سرفہرست اور زیادہ اہم دو سفر ہیں، نمبر ایک: حجاز مقدس کی والہانہ حاضری، نمبر دو: دارالعلوم دیوبند کا نیاز مندانہ سفر۔

مذکورہ دونوں اسفار کے دوران اپنے تاثرات و مشاہدات اور یادداشتوں کو میں نے اپنی ڈائریوں میں اس مقصد کے تحت بڑے شوق و ذوق کے ساتھ قلمبند کر دیا تھا کہ مستقبل میں اگر زندگی باقی رہی تو وقتاً فوقتاً اپنی روح کی تازگی اور اپنے قلبی جذبات کی تسکین کے لئے ان تاثرات و مشاہدات کو پڑھ کر اپنی پرانی یادوں کو تازہ کرتا رہوں گا، اور ان میں جو مفید معلومات ہوں گی انہیں زبانی طور پر اپنے دوست و احباب اور عزیز طلبہ تک پہنچانے کی کوشش بھی کرتا رہوں گا، اپنے تاثرات کو ترتیب دے کر شائع کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔

تاہم بعض مخلص دوستوں کے اصرار پر سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے نیاز مندانہ سفر کی روداد کو ترتیب دے کر ماہنامہ ”بینات“ کراچی سے چار قسطوں میں شائع کرانے کا ارادہ کیا، چنانچہ اس کی پہلی قسط جب شمارہ ماہ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ مطابق ماہ جون ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی تو قارئین نے اسے بہت ہی شوق سے پڑھا اور احقر کی ہمت افزائی کے لئے بعض اہل علم حضرات نے خطوط لکھے اور بعضوں نے فون کیا اور مزید ہمت افزائی اس سے ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند کا

ترجمان ”ماہنامہ دارالعلوم“ نے بھی اسے دو قسطوں میں ماہ ستمبر و اکتوبر ۲۰۱۵ء کے شماروں میں شائع کیا، پھر ”ماہنامہ بیداری“ حیدرآباد نے بھی تین قسطوں میں ماہ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۵ء کے شماروں میں شائع کیا۔

دارالعلوم دیوبند کے سفرنامہ کی مقبولیت اور قارئین کی مخلصانہ دعاؤں کی برکت سے میرے اندر یہ ہمت پیدا ہوئی کہ حجاز مقدس کی والہانہ حاضری کی یادداشتوں کو بھی ترتیب دوں اور اسے بھی سفرنامے کی صورت میں قارئین کے سامنے پیش کر دوں، چنانچہ ترتیب دینے کے بعد ماہنامہ ”بینات“ کراچی سے اس کی اشاعت کا سلسلہ بھی قسط وار شروع ہو گیا اور چھ قسطوں کے اندر ماہ ربیع الاول تا ماہ شعبان ۱۴۳۸ھ کے چھ شماروں میں شائع ہو گیا۔ اس دوران کئی اہل علم و مخلص حضرات اور دوست و احباب نے ہمت افزائی فرماتے ہوئے کتابی شکل میں ان سفرناموں کو شائع کرنے کا صرف مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ اصرار بھی فرمایا، ان کی اس ہمت افزائی کو اپنے لئے سعادت سمجھتے ہوئے احقر نے مذکورہ دونوں مقامات کے سفرنامے کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کیا، اور دونوں کی روداد سفر کی ترتیب میں تاریخ کے بجائے عظمت کو مد نظر رکھا گیا، لہذا حجاز مقدس کے تقدس کی بنیاد پر اس کی روداد کو مقدم رکھا گیا، اور پھر عالم اسلام کے ایک منفرد و بے مثال دینی و علمی مرکز دارالعلوم دیوبند کے سفر کا تذکرہ کیا گیا۔

مجھ جیسے گوشہ نشین و عزلت پسند طالب علم کو مذکورہ اسفار پر روانگی کے لئے حرمین شریفین کی والہانہ محبت و عقیدت اور دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابرین سے نیاز مندانہ وابستگی و تعلق نے صرف آمادہ ہی نہیں بلکہ بے تاب کر دیا تھا، اور میں حافظ شیرازیؒ کے مندرجہ ذیل شعر کا مصداق بن گیا تھا۔

من کز وطن سفر نگزیدم بعمر خویش
در عشق دیدن تو ہوا خواہ غزتم

مذکورہ دونوں اسفار کے علاوہ میری زندگی میں میرے چند اہم دیگر اسفار بھی ہو چکے ہیں، جن میں سے تین مختلف اسفار تو ایسے تھے جن میں احقر کو شاہی مہمان کی حیثیت حاصل رہی تھی اور تین الگ الگ بادشاہوں سے ملاقات بھی ہو گئی تھی، اُن اسفار کی یادداشتیں بھی اہم اور مفید معلومات پر مشتمل اور احقر کے پاس محفوظ ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ جن والہانہ جذبات کے تحت اس سفر نامے کے اسفار انجام پذیر ہو چکے ہیں دیگر اسفار کے جذبات ان کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے! اس لئے اُن دیگر اسفار کی یادداشتوں کو سرِ دست نہ تو ترتیب دی گئی اور نہ ہی اس سفر نامے میں ان کی روداد کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی، بلکہ حافظ شیرازیؒ کے مندرجہ ذیل شعر کے مطابق دنیوی شان و شوکت والے بادشاہوں اور طاقتور لوگوں کی افسانہ گوئی سے کنارہ کشی کرتے ہوئے محبت و وفاداری کی داستان بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا اور نام بھی ”حکایتِ مہر و وفا“ تجویز کیا گیا۔

ما قصۃ سکندر و داراخواندہ ایم

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مہرس

مجھے پوری امید ہے کہ اس کتاب کے اندر قارئینِ کرام کو مفید معلومات ملنے کے ساتھ ساتھ ان کے دینی جذبات اور ایمانی ولولوں کو جوش و خروش کا سامان بھی مہیا ہوگا، اور وہ اس فقیر کو اپنی غائبانہ دعاؤں میں یاد فرمائیں گے۔

عبدالرؤف غزنوی عفا اللہ عنہ

۱۴۳۸/۱۰/۲۹ھ

۲۰۱۷/۷/۲۴ء

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱	پیش لفظ	۵
۲	حجاز مقدس کی والہانہ حاضری	۲۱
۳	ایک عارف باللہ صاحبِ حال بزرگ کی دعا کا اثر	۲۲
۴	عارف باللہ حضرت حافظ عبدالستار صاحب کا مختصر تذکرہ	۲۵
۵	نوٹ	۳۰
۶	جامعۃ الملک سعود ریاض میں داخلہ لینے کا داعیہ	۳۰
۷	احقر کا ایک خواب اور جامعۃ الملک سعود کی طرف سے ہمت افزا اطلاع	۳۱
۸	حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہم کا ایک خواب	۳۲
۹	حضرت الاستاذ مولانا معراج الحق صاحب کی ایک کارآمد نصیحت	۳۳
۱۰	جامعۃ الملک سعود میں داخلہ کی اطلاع	۳۴
۱۱	جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں قیام اور حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ کی ایک قیمتی نصیحت	۳۵

۱۲	کراچی سے ریاض روانگی	۳۷
۱۳	مرکز تجلیات کی پہلی زیارت	۳۹
۱۴	غارِ حراء کی زیارت	۴۲
۱۵	غارِ حراء کی زیارت سے تین باتوں کا ذہن نشین ہو جانا	۴۴
۱۶	کعبۃ اللہ کا الوداعی طواف	۴۸
۱۷	مدینہ منورہ روانگی	۴۹
۱۸	مسجدِ قبا کی زیارت اور اس کا ذکرِ خیر	۵۰
۱۹	مسجدِ قباء سے مسجدِ نبوی کی حاضری کے لیے روانگی	۵۲
۲۰	روضہ مبارک پر حاضری اور سلام پیش کرنے کی سعادت	۵۶
۲۱	مولانا عبدالرحمن جامیؒ کے قصیدہ نعتیہ کا قصہ	۵۷
۲۲	ترجمہ و مفہوم	۵۸
۲۳	بشارتِ نبیؐ کا ایک واقعہ	۶۰
۲۴	خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مرقد کے سامنے	۶۲
۲۵	خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے مرقد کے سامنے	۶۶
۲۶	پہلا واقعہ	۶۹
۲۷	دوسرا واقعہ	۷۰
۲۸	تیسرا واقعہ	۷۱
۲۹	فاروقِ اعظمؓ کی آخری تمنا	۷۳
۳۰	مسجدِ نبوی کی اذانیں	۷۵
۳۱	حضرت بلالؓ کا ایک واقعہ	۷۶

۷۷	مسجد نبوی کی نمازیں اور امام حرم سے پہلی ملاقات	۳۲
۸۰	روضہ جنت میں حاضری	۳۳
۸۱	نبی کریم ﷺ کی زندگی کے آخری دن کا ایک منظر	۳۴
۸۳	ستونہائے رحمت کی زیارت	۳۵
۸۳	اسطوانہ حنائہ	۳۶
۸۵	اسطوانہ ابولبابہؓ	۳۷
۸۹	حجاز مقدس سے واپسی	۳۸
۹۰	”جامعۃ الملک سعود“ کے شب و روز	۳۹
۹۳	”جامعۃ الملک سعود“ کے ماحول میں عربی زبان سیکھنے کا ایک اچھا موقع	۴۰
۹۵	آئینہ دارالعلوم کی رپورٹ	۴۱
۹۶	عرب علماء سے استفادہ کا موقع	۴۲
۹۸	سماعۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر خیر	۴۳
۹۹	شیخ ابن بازؒ سے پہلی بار ٹیلیفون پر رابطہ	۴۴
۱۰۰	شیخ ابن بازؒ سے احقر کی پہلی ملاقات	۴۵
۱۰۴	شیخ ابن بازؒ کی بے پناہ مصروفیت و تحمل کا ایک واقعہ	۴۶
۱۰۶	شیخ کی وفات اور مسجد حرام میں نماز جنازہ	۴۷
۱۰۷	فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین کی خدمت میں حاضری اور ان کا تذکرہ خیر	۴۸
۱۰۹	کچے گھر میں رہنے کو ترجیح دینا اور پکا گھر طلبہ کے لیے وقف کر دینا	۴۹

۱۲۶	شیخ عبداللہ بن عبدالرحمن بن جبرین سے استفادہ اور ان کا مختصر تذکرہ	۶۴
۱۲۹	شیخ کی سخاوت و رحم دلی	۶۵
۱۳۰	شیخ ابن جبرین کی تاریخ ولادت و وفات	۶۶
۱۳۱	حضرت شیخ عبدالفتاح ابو غدّہ سے استفادہ کا موقع اور ان کا تذکرہ خیر	۶۷
۱۳۲	شیخ عبدالفتاح ابو غدّہ سے پہلی ملاقات	۶۸

۶۹	شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ کی ”جامعۃ الملک سعود“ منتقلی اور احقر کے لیے استفادہ کا ایک نادر موقع	۱۳۴
۷۰	علوم دینیہ کے سچے متلاشی	۱۳۶
۷۱	پہلا واقعہ	۱۳۷
۷۲	دوسرا واقعہ	۱۴۲
۷۳	تیسرا واقعہ	۱۴۶
۷۴	چوتھا واقعہ	۱۴۷
۷۵	دارالعلوم دیوبند اور اس کے علماء و مشائخ سے بے پناہ محبت و عقیدت	۱۴۸
۷۶	خوش اخلاقی و خاکساری میں یکتا	۱۵۴
۷۷	تحقیقی ذوق اور صحیح الفاظ کے انتخاب میں مہارت و پختگی	۱۵۶
۷۸	شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ کی خدمت میں مزید کچھ عرصہ تک رہنے کی تمنا و کوشش	۱۵۹
۷۹	حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب کے نام شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ کی ایک تحریر	۱۶۰
۸۰	شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ کی تحریر کا عکس	۱۶۲
۸۱	”جامعۃ الملک سعود“ سے احقر کی دارالعلوم دیوبند واپسی	۱۶۵
۸۲	”جامعۃ الملک سعود“ کے ماحول میں اپنے مسلک پر احقر کا ثابت قدم رہنا اور اس کے اسباب	۱۶۶

۸۳	شیخ عبدالفتاح ابو غدہ سے احقر کی آخری ملاقات اور ان کی طرف سے اجازت حدیث	۱۶۷
۸۴	شیخ عبدالفتاح ابو غدہ کی طرف سے اجازت نامہ حدیث کا عکس	۱۷۰
۸۵	شیخ ابو غدہ کی ایک اہم نصیحت	۱۷۰
۸۶	شیخ ابو غدہ کی وفات اور مسجد نبوی میں نماز جنازہ اور جنت البقیع میں تدفین	۱۷۱
۸۷	دارالعلوم دیوبند (انڈیا) کا نیاز مندانہ سفر	۱۷۵
۸۸	دارالعلوم دیوبند کا پہلا سفر	۱۷۶
۸۹	امامت و خطابت اور تدریس کی ذمہ داری	۱۷۷
۹۰	دارالعلوم دیوبند سے فراق کا غم	۱۷۹
۹۱	کراچی میں قیام اور دارالعلوم دیوبند سے مستقل رابطہ	۱۸۱
۹۲	خوابوں میں دارالعلوم دیوبند کی زیارت اور ایک لطیفہ	۱۸۳
۹۳	اپنے مشائخ و اساتذہ کرام کی زیارت کے چند مواقع	۱۸۴
۹۴	حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب کی طرف سے دیوبند حاضری کی دعوت	۱۸۷
۹۵	ماہ رجب میں اسباق کا اختتام اور دیوبند کا سفر	۱۸۹
۹۶	جامع مسجد رشید کا تذکرہ	۱۹۴
۹۷	کچھ تذکرہ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب کے بارے میں	۱۹۶
۹۸	علمی و انتظامی صلاحیت	۱۹۶

۱۹۷	سفر و حضر میں تہجد کی پابندی	۹۹
۱۹۸	مولینا کی ہمت و شجاعت اور ایک اہم واقعہ	۱۰۰
۲۰۰	مسلمانان ہند کے مسائل سے گہری دلچسپی	۱۰۱
۲۰۰	حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہم کی خدمت میں حاضری اور ان کا ذکرِ خیر	۱۰۲
۲۰۳	حضرت الاستاذ کی قناعت و استغناء	۱۰۳
۲۰۵	حضرت الاستاذ سے خصوصی اجازتِ حدیث کی درخواست	۱۰۴
۲۰۷	اجازت نامہ حدیث کا عکس	۱۰۵
۲۰۸	حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب کی خدمت میں حاضری اور ان کا ذکرِ خیر	۱۰۶
۲۰۹	تصنیف و تالیف کی صلاحیت	۱۰۷
۲۱۰	مولانا کی تحریر کی خصوصیات	۱۰۸
۲۱۱	تواضع و خاکساری	۱۰۹
۲۱۳	پہلا واقعہ	۱۱۰
۲۱۳	دوسرا واقعہ	۱۱۱
۲۱۴	تیسرا واقعہ	۱۱۲
۲۱۵	چوتھا واقعہ	۱۱۳
۲۱۸	حضرت الاستاذ مولانا قمر الدین صاحب زید مجدہم کی خدمت میں حاضری	۱۱۴
۲۲۱	حضرت مہتمم صاحب سے ملاقات	۱۱۵

۲۲۳	دارالعلوم کے دیگر مشائخ کرام سے ملاقاتیں	۱۱۶
۲۲۴	جناب مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب سے ملاقات	۱۱۷
۲۲۵	پہلا واقعہ	۱۱۸
۲۲۶	دوسرا واقعہ	۱۱۹
۲۲۷	اپنے ہم عصر اور دوست اساتذہ سے ملاقاتیں	۱۲۰
۲۲۸	چند نوجوان اساتذہ سے ملاقاتیں	۱۲۱
۲۳۰	جامع مسجد رشید میں نماز جمعہ کی امامت	۱۲۲
۲۳۲	شہر دیوبند کے چند دیگر دینی اداروں کی زیارت	۱۲۳
۲۳۴	دارالعلوم دیوبند کی ترقی کے چند اہم اسباب	۱۲۴
۲۳۴	۱:- اخلاص و للہیت	۱۲۵
۲۳۵	۲:- محنت و سادگی	۱۲۶
۲۳۸	۳:- بااختیار شورائی نظام	۱۲۷
۲۳۹	۴:- وقفے وقفے سے نتیجہ خیز اختلافات کا رونما ہونا	۱۲۸
۲۴۱	۵:- صلاحیت و صالحیت کی بنیاد پر تقرریاں و ترقیاں	۱۲۹
۲۴۵	دیگر مدارس کے ذمہ داران کو بھی دارالعلوم دیوبند کی پیروی کرنی چاہیے	۱۳۰
۲۴۶	گنگوہ و تھانہ بھون حاضری کی تمنا	۱۳۱
۲۵۱	اکابرین دارالعلوم کی طرف سے احقر کی ہمت افزائی اور احقر کو اپنی کم مائیگی کا احساس	۱۳۲

حجازِ مُقَدَّس کی وَالہِیَّانَ حَاضِرِی

مورِ مسکین ہوئے داشت کہ در کعبہ رسد
دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید
(سعدی شیرازی)

حجازِ مقدّس کی والہانہ حاضری

ایک مسلمان بچہ اپنے بچپن کے اندر جیسے ہی کچھ ہوش سنبھالنے اور بات سمجھنے لگتا ہے تو اپنے والدین اور بڑوں سے کعبۃ اللہ اور روضہ رسول مقبول (ﷺ) کا تذکرہ سنتا رہتا ہے، اور جب وہ تقریباً سات سال کی عمر میں نماز پڑھنا شروع کر دیتا ہے اور اس کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ نماز کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ نمازی کا رخ کعبۃ اللہ کی طرف ہو تو اس کے دل میں کعبۃ اللہ کی عظمت اور اس کی طرف ایک غیر اختیاری کشش پیدا ہو جاتی ہے، اور جب اس کو یہ بتایا جاتا ہے کہ اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا آخری نبی مان لیا جائے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ اسلام کے بنیادی احکام میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عاقل بالغ صاحب استطاعت مسلمان کے ذمہ زندگی میں ایک مرتبہ حج بہت اللہ فرض ہے تو اس کا دل حجازِ مقدس کی حاضری کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے، اور آگے چل کر جب اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا کچھ حصہ اور اس کے ضمن میں مدینہ منورہ کا تعارف اور روضہ رسول (ﷺ) کا تقدس و عظمت بتائی جاتی ہے تو اس کی بے تابی ایک تڑپ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

راقم الحروف کے بچپن اور طالب علمی کا زمانہ حرمین شریفین کی محبت اور وہاں پر حاضری کی تمنا کے حوالہ سے مذکورہ بالا کیفیت کے ساتھ گزر گیا، اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے حاضری کا موقع نہ مل سکا، درسِ نظامی سے فراغت کے بعد ہی

اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی سال ۱۴۰۲ھ-۱۴۰۳ھ کو تدریس کی خدمت پر مامور ہوا، جب کہ مسجد دارالعلوم کی امامت و خطابت کی ذمہ داری دورہ حدیث پڑھنے کے سال سے احقر کے سپرد ہو چکی تھی، تدریس و امامت دونوں کے عوض دارالعلوم دیوبند سے مجھے چھ سو نوے روپے مشاہرہ ملتا تھا، جس میں ظاہری قلت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت رکھی تھی، تاہم اس معمولی مشاہرہ سے اتنا بچانا جو حج کے اخراجات کے لیے کافی ہو جاتا، ناممکن تھا، لہذا! دل ہی دل میں حرمین شریفین کی حاضری کی تمنا جی رہتی تھی، اور اس تمنا کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دعا کے علاوہ کوئی اور ظاہری سبب نظر نہیں آ رہا تھا:

اے غائب از نظر کہ شدے ہمنشینِ دل
میگویمت ثنا و دعا سے فرستمت

ایک عارف باللہ صاحبِ حال بزرگ کی دعا کا اثر

دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے زمانہ میں جناب قاری عبدالحفیظ صاحب زید مجدہم - استاذ شعبہ تجوید دارالعلوم دیوبند - کی معیت میں ان ہی کی موٹر سائیکل پر ایک دفعہ بروز اتوار ۱۷/۱۲/۱۴۰۶ھ کو شیخ علاء الدین علی بن احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳ ربیع الاول ۶۹۰ھ) خلیفہ اجل حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۵ محرم ۶۶۴ھ) کے مزار پر حاضری دینے کے لیے کلیر شریف جو دیوبند سے تقریباً پچاس کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، جانے کا پروگرام بنا، قاری صاحب چونکہ دیوبند کے مضافات اور ان کے راستوں سے خوب واقف تھے، اس لیے یہ راستہ مختصر وقت میں طے ہوا۔

آستانہ صابری پر حاضری دینے سے سکون و اطمینان کے بجائے وہاں پر موجود بدعت کے ماحول کو دیکھ کر کدورت لاحق ہوگئی۔ فاتحہ خوانی و ایصالِ ثواب کے لیے بھی مزار کے بجائے قریب میں واقع مسجد کو منتخب کرنا پڑا، کیونکہ مزار کے پاس موجود بدعات کو روکنا ہمارے بس میں نہ تھا، البتہ وہاں سے الگ ہونا ہمارے بس میں تھا، اس لیے جلد از جلد وہاں سے الگ ہونے کو ترجیح دی، اور میں نے رفیق سفر اور اپنے کرم فرما جناب قاری صاحب موصوف سے یہ بات بھی عرض کر دی کہ اگر پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ یہاں ایسا ماحول ہے تو حاضری کی کوشش نہ کی جاتی۔ مسجد میں فاتحہ خوانی اور ایصالِ ثواب کر کے ہم نے واپسی کا پروگرام بنایا، جناب قاری صاحب نے واپسی میں بتایا کہ راستہ میں ایک گاؤں ”نانکہ“ آتا ہے، جہاں حضرت حافظ عبدالستار صاحب دامت برکاتہم رہتے ہیں، جو کہ تارک الدنیا، صاحبِ حال، مستجاب الدعویٰ اور حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ (متوفی ۱۲ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ) کے خلیفہ ہیں، اگر آپ چاہتے ہیں تو ان کی خدمت میں بھی حاضری دیتے ہیں۔ میں نے کہا: یہ تو میری بڑی سعادت ہوگی، اور اس حاضری سے اس کدورت کی بھی بڑی حد تک تلافی ہو جائے گی، جو آستانہ صابری پر حاضری کے وقت وہاں پر موجود بدعات کے ماحول کو دیکھ کر لاحق ہوگئی ہے۔

بہر صورت حضرت حافظ عبدالستار صاحب سے ملاقات کے لیے اُن کے گاؤں ”نانکہ“ پہنچے، اور اُن کے مکان پر (جو ایک سادہ سا مکان تھا) حاضری دی، اس سے قبل کہ ہم کسی سے یہ معلوم کر لیتے کہ حافظ صاحب تشریف فرما ہیں یا نہیں؟

ملاقات ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس مکان سے سادہ لباس میں ملبوس ایک شخص باہر تشریف لائے اور مکان سے ذرا فاصلہ پر واقع مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ میرا تو یہ خیال ہوا کہ حافظ صاحب کے خدام یا متعلقین میں سے یہ کوئی صاحب ہوں گے، لیکن قاری عبد الحفیظ صاحب چونکہ پہلے ہی سے ان سے واقف تھے، فرمانے لگے: یہی حضرت حافظ عبد الستار صاحب زید مجدہم ہیں۔ سلام و مصافحہ تو اسی وقت ہم نے آگے بڑھ کر ان سے کر لیا، لیکن انہوں نے سلام کے جواب و مصافحہ کے علاوہ ہم سے اور نہ ہی وہاں پر موجود کسی اور شخص سے کوئی خاص بات کی، اور مسجد کی طرف چلے گئے، ہم بھی پیچھے پیچھے مسجد تک گئے، مسجد پہنچ کر حضرت حافظ صاحب مسجد کے ایک حصہ میں بچھی ہوئی ریت پر پشت کے بل لیٹ گئے، اور کسی سے کوئی بات نہیں کی، اور چونکہ کسی نماز کا وقت نہیں تھا، اس لیے ہم بھی ان کے قریب بیٹھ گئے، ان کی سادگی اور اونچی نسبت کو دیکھتے ہوئے نبی کریم ﷺ کی وہ حدیث پاک یاد آنا ایک قدرتی بات تھی جو آپ ﷺ نے حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر ارشاد فرمائی تھی کہ:

”كَمْ مِنْ أَشْعَثَ أَغْبَرَ ذِي طَمَرٍ لَا يُؤْبَهُ لَهُ لَوْ أَقْسَمَ

عَلَى اللَّهِ لَأَبْرَهُ مِنْهُمْ الْبَرَاءُ بْنُ مَالِكٍ (رواہ الترمذی بسندہ

عن أنس بن مالك رضي الله عنه)“

یعنی ”بہت سے پراگندہ بال، غبار آلود جسم، دو پرانے کپڑے پہننے والے جن کو

عام طور پر کوئی اہمیت نہ دی جاتی ہو، (اللہ کے یہاں ان کا اتنا اونچا مقام ہوتا ہے

کہ) اگر وہ کسی بات کی قسم بھی کھا لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ (ان کی بات کی لاج

رکھتے ہوئے) ان کی قسم کو پوری کر دیتا ہے، جن میں سے ایک براء بن مالک

بھی ہیں۔“

قاری عبدالحفیظ صاحب نے حضرت حافظ صاحبؒ سے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا کہ میرے ساتھ آنے والے یہ شخص دارالعلوم دیوبند کے نوجوان اساتذہ میں سے ہیں اور دارالعلوم دیوبند کی مسجد کے امام بھی ہیں، آپ سے ملنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں، حافظ صاحب ایک دم اٹھ گئے، میں نے ان سے ادب کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے مزاج پرسی کی، انہوں نے بھی خیریت پوچھی، میں نے ان سے تین دعاؤں کی درخواست کی، جن میں سے ایک دعائے بیت اللہ نصیب ہونے سے متعلق تھی، انہوں نے فوراً دونوں ہاتھ اٹھا کر ذرا لمبی سی خفیہ دعا کی، دعا کے بعد ہم نے اُن سے رخصت لی، اور واپس دیوبند آ گئے۔

اس خدا رسیدہ بزرگ حضرت حافظ عبدالستار صاحب رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً کی دعا کا اثر رقم نے اس طرح دیکھا کہ ۱۷/ ذوالحجہ ۱۴۰۶ھ کو مذکورہ دعا ہوئی تھی۔ ۲۱/ رذو القعدة ۱۴۰۷ھ کو غیر متوقع طور پر جامعۃ الملک سعود ریاض میں احقر کے داخلہ کی اطلاع موصول ہوئی۔ یکم صفر ۱۴۰۸ھ کو ریاض پہنچا، ۱۹/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ کو بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب حرم مکی کی پہلی زیارت اور عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی اور شب جمعہ ۲۰/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ کو مسجد نبوی اور روضۃ اقدس (ﷺ) کی پہلی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، اور ماہ ذوالحجہ ۱۴۰۸ھ ہی کو پہلے حج کی سعادت میسر ہوئی۔ مذکورہ اجمال کی تفصیل درج کرنے سے پہلے حضرت حافظ عبدالستار صاحب قدس سرہ کا مختصر تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عارف باللہ حضرت حافظ عبدالستار صاحب کا مختصر تذکرہ

حضرت حافظ عبدالستار صاحب رحمہ اللہ نے ۱۴/ شعبان ۱۳۲۷ھ مطابق ۲/ ستمبر ۱۹۰۹ء موضع ”ہرچند پور“ تحصیل ”روڑکی“ ضلع ”سہارن پور“ میں ایک

ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں، جہاں تعلیم و تربیت سے کوئی آشنا نہ تھا، اس لیے ان کا نام بھی اسی ماحول کے مطابق شبِ براءت سے منسوب کرتے ہوئے ”شہرانی“ رکھا گیا۔ بچپن میں ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا تو پرورش کی ذمہ داری دادا محترم نے اپنے کندھوں پر لی۔ کچھ عرصہ بعد دادا جان کا بھی انتقال ہو گیا تو ان کی پرورش کی ذمہ داری نانا محترم پر آ گئی۔ نانا جان نے ان کو کچھ ابتدائی دینی تعلیم اور پھر کچھ ابتدائی عصری تعلیم دلا دی، پھر انہوں نے بدرجہٴ مجبوری تعلیم کا سلسلہ موقوف کر کے گھر کا کام اور والدہ محترمہ کی خدمت شروع کر دی، اس کے بعد دل میں حفظِ قرآن کا ولولہ پیدا ہوا اور اپنی والدہ محترمہ سے اس کا تذکرہ کر دیا۔ والدہ نے اجازت دی، تو انہوں نے حفظِ قرآن کے ارادہ سے رائے پور کا سفر شروع کیا، لیکن راستہ میں ایک قصبہ ”بیٹ“ پڑتا ہے، جو رائے پور سے تقریباً آٹھ کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، یہاں انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور معلوم ہوا کہ یہاں پر بھی حفظِ قرآن کرایا جاتا ہے، تو انہوں نے رائے پور کا ارادہ ملتوی کر دیا، اور ”بیٹ“ میں حفظِ قرآن شروع کیا، جہاں کھانے کا کوئی نظم نہیں تھا، البتہ ایک طالب علم نے جس کا کھانا کسی کے گھر سے آتا تھا، بہ خوشی اپنے کھانے میں ان کو شریک کیا، اور اس طرح انہوں نے حفظِ قرآن مکمل کر لیا۔

حفظِ قرآن کے بعد مزید تعلیم کے لیے مدرسہ رکنیہ جو ”سکروڈہ“ نامی بستی میں واقع تھا، داخل ہوئے، جہاں انہوں نے فارسی کی کئی کتابیں مولانا خدا بخش صاحب سے پڑھیں، آپ کی تواضع و خاکساری اور اساتذہ کی خدمت و احترام کی وجہ سے منتظمین و اساتذہ بالخصوص مولانا خدا بخش صاحب آپ پر بے حد شفقت

وعنایت فرماتے، اور مولانا موصوف ہی آپ کو رائے پور حضرت اقدس مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی خدمتِ بابرکت میں لے جاتے رہے، یہاں تک کہ آپ کو حضرت رائے پوری قدس سرہ سے والہانہ محبت و عقیدت پیدا ہو گئی، اور ان کے حلقہٴ ارادت میں شامل ہو گئے، حضرت رائے پوریؒ نے آپ کا نام تبدیل کر کے ”شبراتی“ کے بجائے ”عبدالستار“ تجویز فرمایا، اور آپ کی اصلاح پر خوب توجہ دی، یہاں تک کہ ماہِ فروری ۱۹۵۰ء کو انہیں اجازتِ بیعتِ مرحمت فرماتے ہوئے خلافت سے سرفراز فرمایا۔

حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی توجہ و نسبت کا یہ کرشمہ ظاہر ہوا کہ ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولنے والے ”شبراتی“ جہاں تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ تھا، عارف باللہ حضرت حافظ عبدالستار صاحب نانکوی کے نام سے مرجعِ خاص و عام بن گئے۔ بڑے بڑے اہل علم ان کے معتقد و مداح ہو گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے ماحول میں بھی ان کے جاننے والوں کے درمیان یہ مشہور ہو گیا کہ وہ صاحبِ حال اور مستجاب الدعوت بزرگ ہیں۔ ہمارے استاذ و مرشدِ فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی صاحب قدس سرہ۔ صدر مفتی دارالعلوم دیوبند۔ اور دیگر اکابرین بھی ان سے کافی محبت فرماتے تھے۔ حضرت مولانا محمد سعیدی صاحب دامت برکاتہم۔ ناظم و متولی مدرسہ مظاہر علوم (وقف) سہارن پور ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

”وہ ممتاز مستجاب الدعوات اور مرجعِ خلائق ہستی تھے، جہاں حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہ سے انتساب نے ان کی عظمت کو چار

چاند لگائے ہیں، وہیں حضرت حافظ صاحب موصوف کی ذات گرامی کی نسبت سے ”نانکہ“ نامی بستی کی شہرت و نیک نامی کو قابلِ رشک عروج حاصل ہوا۔“
(تذکرہ حافظ عبدالستار ناکوئی)

حضرت مولانا افتخار الحسن کاندہلوی صاحب ان سے متعلق رقم طراز ہیں کہ:
”وہ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہ و برز اللہ مضجعہ کے اجل خلفاء میں سے تھے، مستجاب الدعوات تھے، سادگی، بے تکلفی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، اپنے شیخ سے بے حد محبت اور عقیدت تھی، تا آنکہ شکل و شباهت میں حضرت رائے پوری کا عکس نظر آنے لگا تھا، اور شیخ و مرشد ہی کی نسبت سے رائے پور سے بے انتہاء تعلق تھا، رائے پور کی طرف پیر پھیلا نا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔“
(تذکرہ حافظ عبدالستار ناکوئی)

حضرت حافظ عبدالستار صاحب اگرچہ اصطلاحی عالم نہیں تھے، لیکن علمائے ربانین بالخصوص ان کے شیخ حضرت اقدس مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ کی صحبت و نسبت کی برکت سے عالم گر ہو گئے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے تعلیم و تربیت کے میدان میں ان سے بڑا کام لیا۔ انہوں نے اگست ۱۹۳۱ء کو نانکہ نامی گاؤں کی مسجد میں وہاں کے لوگوں کی درخواست پر امامت کا سلسلہ شروع فرمایا، اور پوری زندگی اسی مسجد میں امامت کے ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت، اصلاح و تزکیہ نفس کی قدیلیں روشن کرتے ہوئے گزار دی۔ ۱۹۳۳ء کو مسجد کی شرقی سمت میں ایک مکتب قائم کیا، جس کا نام ”مکتب اسلامی امدادی“ تجویز فرمایا۔ رفتہ رفتہ طلبہ کی تعداد بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ انہوں نے اس مکتب کو موضع ”گند یوڑہ“ کی سرحد میں منتقل کرایا، اور اپنے شیخ الشیخ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہ (متوفی ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ) سے منسوب فرماتے ہوئے اس

کا نام ”مدرسہ فیض الرحیم“ رکھ دیا، جہاں تعلیم و تربیت، مردم سازی و تزکیہ کا سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا، اور حضرت حافظ صاحبؒ کے وصال کے بعد ان کے متوسلین و متعلقین نے اس ادارہ کو ”جامعہ ستاریہ فیض الرحیم“ کا عنوان دیا، جس سے تادم تحریر لوگ استفادہ و استفادہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تاروز قیامت اس سلسلہ کو جاری رکھیں۔

حضرت حافظ صاحبؒ کو حرمین شریفین سے عشق کی حد تک محبت تھی، اور یہ دعا بکثرت فرماتے تھے: ”یا اللہ! مجھے اپنے گھر بلا لے اور وہیں موت نصیب فرمادے“، اللہ تعالیٰ نے ان کو پانچ مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت سے نوازا۔ آخری حج ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۹۹۰ء کو ادا فرمایا، جہاں ان کی آخری تمنا پوری ہو گئی، اور حج سے فارغ ہوتے ہی بروز اتوار ۱۶ ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۸ جولائی ۱۹۹۰ء اذانِ ظہر کے وقت مکہ مکرمہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی دن بعد نمازِ عصر مدرسہ صولتیہ میں ان کی پہلی نمازِ جنازہ حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی دامت برکاتہم - صاحبزادہ محترم حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہ - کی اقتداء میں ادا کی گئی، اور دوسری نمازِ جنازہ بعد نمازِ مغرب مسجد حرام میں امام حرم کی اقتداء میں ادا کی گئی، اور پھر جنت المعلیٰ میں ان کو سپرد خاک کیا گیا۔ کسی نے ان کے بارے میں خوب کہا ہے:

بہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا
ستار پیر بھی صاحبِ نسبت فقیر تھا

اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

نوٹ:

حضرت حافظ عبدالستار صاحب نانکوی قدس سرہ کی زندگی سے متعلق مذکورہ بالا مضمون میں اپنی ذاتی معلومات کے ساتھ ساتھ ”تذکرہ حافظ عبدالستار نانکوی“ تالیف: مولانا محمد عابد ندوی زید مجدہم سے بھی کافی استفادہ کیا گیا ہے۔ مذکورہ کتاب کافی تلاش کے بعد میرے ہم نام اور دورہ حدیث کے محترم ساتھی برادر مکرم جناب مولانا قاری عبدالرؤف صاحب بلند شہری زید مجدہم استاذ تجوید و قراءت دارالعلوم دیوبند نے ”نانکہ“ گاؤں سے منگوا کر کراچی بھجوا دی۔ جزاء اللہ خیر الجزاء.

جامعۃ الملک سعود ریاض میں داخلہ لینے کا داعیہ

حضرت حافظ عبدالستار صاحب کی خدمت میں حاضری اور ان سے دعا کی درخواست کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک مرتبہ جناب مولانا مجیب اللہ صاحب گونڈوی استاذ دارالعلوم دیوبند (حال استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند) کے کمرہ میں جو دارجدید کے مشرقی حصہ میں دوسری منزل پر واقع تھا، محض ایک ملاقات کے لیے فارغ وقت میں میری حاضری ہوئی، وہاں پر چند نوجوان اساتذہ دارالعلوم کی مجلس جمی ہوئی تھی، اور جامعۃ الملک سعود ریاض سعودی عرب کے شعبہ معہد اللغة العربیۃ میں غیر عرب معلمین و مدرّسین کے داخلہ سے متعلق گفتگو فرما رہے تھے۔ وہ حضرات کہہ رہے تھے کہ اس شعبہ میں غیر عرب معلمین کو عربی زبان میں تدریس کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے، لہذا ہمیں بھی اس کورس میں داخلہ لینے کی کوشش کرنی چاہیے، تاکہ داخلہ کی صورت میں عربی زبان میں استفادہ کے ساتھ ساتھ حرمین شریفین حاضری کا موقع بھی

میسر رہے، میں تو بالکل خالی الذہن اور نووارد تھا، اور صرف ایک ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا، تاہم ان کی مذکورہ بالا گفتگو سن کر میرا جذبہ محبت بھی بیدار ہوا، اور دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ مجھے بھی اس نعمت کے حصول کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ اُدھر اُن حضرات سے اپنے اس داعیہ کے اظہار کے لیے حیا مانع بن رہی تھی، لیکن چونکہ وہ حضرات بے تکلف دوست تھے، اس لیے بالآخر میں نے ان سے یہ گزارش کر ہی لی کہ اگر اجازت ہو تو میں بھی داخلہ کی کوشش کروں، اور آپ حضرات سے راہنمائی حاصل کروں! اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، اُنہوں نے اجازت دینے کے ساتھ ساتھ طریقہ کار اور کاغذات بھیجنے کا پتہ بھی بتا دیا۔

راقم نے عربی زبان میں ایک درخواست برائے داخلہ لکھ کر اپنی سندوں اور دارالعلوم کی طرف سے ایک سفارشی تحریر کے ساتھ بروز جمعہ ۲ ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ کو مذکورہ پتہ پر ارسال کر دی۔ ظاہری اسباب کے اعتبار سے داخلہ کی امید اس وجہ سے کچھ کم تھی کہ داخلے محدود تھے، اور امیدوار لا محدود! صرف دارالعلوم دیوبند کی طرف سے بھی جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، میرے علاوہ کئی دوسرے حضرات نے بھی درخواستیں بھیجی تھیں، اور ”ندوة العلماء“ اور دیگر اداروں سے متعلق حضرات بھی کافی دلچسپی لے رہے تھے، اور مؤثر سفارشات کے ساتھ درخواستیں بھیج رہے تھے۔

احقر کا ایک خواب اور جامعۃ الملک سعود کی طرف سے ہمت افزا

اطلاع

۴ جمادی الثانیہ ۱۴۰۷ھ کو منگل اور بدھ کی درمیانی شب احقر نے خواب دیکھا کہ ”کوئی شخص احقر کا سر مونڈ رہا ہے اور سامنے پانی کا ایک چشمہ بھی نظر آ رہا ہے“ آنکھ کھلنے کے بعد اس مختصر خواب کی تعبیر احقر کے ذہن میں یہ آئی کہ ان شاء اللہ! حج

بیت اللہ نصیب ہوگا، سر مونڈنا احرام کھولنے کی طرف اشارہ ہے، اور پانی کا چشمہ آبِ زمزم ہے۔ فجر کی نماز کے بعد اس خواب کا تذکرہ دارالعلوم دیوبند کے ایک بڑے استاذِ حدیث حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی دامت برکاتہم سے کر دیا تو انہوں نے مذکورہ بالا تعبیر کی تحسین فرمائی۔

اس خواب کے گیارہ دن بعد بروز ہفتہ ۱۴ جمادی الثانیہ ۱۴۰۷ھ کو جامعۃ الملک سعود کی طرف سے ایک جوابی تحریر موصول ہوئی، جس میں میری بھیجی ہوئی درخواست موصول ہونے اور اس پر غور کرنے کا تذکرہ تھا اور ساتھ ساتھ ایک فارم بھی بھیجا گیا تھا اور مجھے اس فارم کو پُر کرنے اور سعودی عرب کے سفارت خانے سے تصدیق شدہ اسناد کے ساتھ جلد از جلد بھیجنے کا حکم دیا گیا تھا۔ احقر نے حکم کے مطابق فارم کو پُر کر کے مطلوبہ کاغذات کے ساتھ بروز پیر ۲۳ جمادی الثانیہ ۱۴۰۷ھ کو بذریعہ ڈاک ارسال کر دیا۔

حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہم کا ایک خواب

۲۱ جمادی الثانیہ ۱۴۰۷ھ کو بروز ہفتہ دارالحدیث تحتانی دارالعلوم دیوبند میں جلسہ انعامیہ ہو رہا تھا۔ حسب معمول اساتذہ دارالعلوم بشمول استاذِ حدیث حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہم (حالِ شیخ الحدیث و صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔ احقر بھی حضرت الاستاذ کے قریب ذرا پیچھے کی طرف بیٹھا ہوا تھا، اسی دوران حضرت الاستاذ مدظلہم نے مجھے اپنے قریب بلا کر آہستہ آواز میں بتایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ ”میں حج

پر گیا ہوں اور آپ (عبدالرؤف) بھی ساتھ ہیں۔“ حضرت الاستاذ کے اس مبارک خواب کو ”بشارتِ منامی“ سمجھ کر حرمین شریفین حاضری کی امید میں اضافہ ہو گیا۔

حضرت الاستاذ مولانا معراج الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کارآمد نصیحت

جامعۃ الملک سعود ریاض میں داخلہ ملنے اور اس بہانے حرمین شریفین حاضری کی امیدوں میں اضافہ ہو رہا تھا، لیکن اپنے محترم استاذ حضرت مولانا معراج الحق صاحب رحمہ اللہ رحمة واسعة۔ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند۔ (متوفی ۱۴۱۲ھ) کی ایک قیمتی نصیحت جس سے انہوں نے اس موقع پر احقر کو نوازا، برابر پیش نظر رہی، حضرت نے فرمایا:

”کسی مفید یا کم از کم جائز مقصد کے حصول کے لیے مناسب طریقہ سے کوشش کرنے اور جائز وسائل بروئے کار لانے میں تو کوئی حرج نہیں، البتہ یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس کوشش کے بعد اگر وہ مقصد حاصل ہوا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے، اور اگر حاصل نہ ہوا تب بھی پریشانی کی ضرورت نہیں، بلکہ سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت ضرور ہوگی کہ یہ مقصد بروقت حاصل نہ ہو سکا اور اسی میں میری بہتری ہوگی۔“

مذکورہ بالا نصیحت کی روشنی میں احقر ذہنی طور پر اس کے لیے بھی آمادہ تھا کہ اگر یہ داخلہ ہو گیا تو اس کو اللہ تعالیٰ کا ایک انعام سمجھوں گا اور اس کے لیے بھی تیار تھا کہ داخلہ نہ ہوا تو پریشان نہیں ہوں گا، بلکہ یہی سوچوں گا کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت اور میری بہتری اسی میں ہوگی۔ حضرت الاستاذ قدس سرہ کی مذکورہ نصیحت کی

برکات آج تک محسوس کر رہا ہوں، اس لیے کہ اپنی محدود زندگی میں مختلف معاملات و مقاصد سے واسطہ پڑتا رہا اور بعض امور کو بہتر سمجھ کر اُن کے حصول کے لیے مناسب انداز سے کوششیں بھی کی گئیں، آگے کبھی تو ایسا ہوا کہ مقاصد حاصل ہوئے اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ بروقت حاصل نہیں ہوئے، لیکن اطمینان دونوں صورتوں میں قائم رہا، فللہ الحمد و المنة۔

جامعۃ الملک سعود میں داخلہ کی اطلاع

۲۱/ ذوالقعدة ۱۴۰۷ھ بروز ہفتہ جامعۃ الملک سعود ریاض سے احقر کے نام دارالعلوم دیوبند کے پتہ پر ایک تحریر موصول ہوئی، جس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ آپ کا داخلہ ”معهد اللغة العربية“ میں منظور ہو چکا ہے۔ آپ ۲۳/ ۲/ ۱۴۰۸ھ سے کم از کم ایک ہفتہ قبل پاکستان جا کر سعودی سفارت خانہ سے رابطہ کریں، جہاں سے آپ کو تعلیمی ویزا اور ریاض جانے کا ٹکٹ دونوں مل جائیں گے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی کرم اور حضرت حافظ عبدالستار صاحب رحمہ اللہ کی دعا کا اثر تھا کہ دارالعلوم دیوبند سے احقر کے علاوہ اور بھی چند ہم عصر اساتذہ نے داخلہ کے لیے درخواستیں بھیجی تھیں، بلکہ احقر نے تو ان ہی کو دیکھ کر اور ان ہی سے راہنمائی حاصل کر کے درخواست بھیجی تھی، لیکن داخلہ صرف احقر کو نصیب ہوا۔

اس داخلہ کی اطلاع اپنے اساتذہ کرام اور حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب رحمہ اللہ۔ مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ کو پہلی ہی فرصت میں کر دی، جنہوں نے خوشی کا اظہار فرماتے ہوئے مبارک باد، دعاؤں اور گراں قدر نصیحتوں سے نوازا۔

اس کے بعد احقر نے پاکستان جانے کی تیاری کر لی، اور تدریس و امامت دونوں سے متعلق دارالعلوم دیوبند کو چھٹی کی درخواست پیش کر دی، جو کہ خوشی کے ساتھ منظور ہو گئی، اور یکم محرم الحرام ۱۴۰۸ھ بروز جمعرات بذریعہ ہوائی جہاز دہلی سے کراچی پہنچا، اور کراچی سے بذریعہ بس کوئٹہ پہنچ کر عزیز واقارب سے ملاقات کر کے ان سے رخصت لی، پھر اسلام آباد جا کر سعودی سفارت خانہ سے تعلیمی ویزا اور کراچی تا ریاض ہوائی جہاز کا ٹکٹ حاصل کر کے ۲۹ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ کو بروز جمعرات اسلام آباد سے کراچی آ گیا۔

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں قیام اور حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ کی ایک قیمتی نصیحت

دارالعلوم دیوبند کے بعد احقر کو جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے ماحول اور اس کی عالی شان مسجد میں ایک غیر اختیاری خوشی اور سکونِ قلب محسوس ہوتا تھا، حالانکہ نہ تو اس ادارے میں مجھے پڑھنے کا موقع ملا تھا، اور نہ ہی بانی جامعہ حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہ کی زیارت کی سعادت ملی تھی، ہاں! معارف السنن مطالعہ کرنے اور دارالعلوم دیوبند میں حضرت بنوری قدس سرہ کا تذکرہ خیر سننے کا موقع ضرور ملا تھا، اور اپنے اساتذہ کرام سے یہ بھی سنا تھا کہ محدث العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ کے شاگردوں میں سے سب سے فائق اور ان کے علوم و معارف کے امین حضرت بنوری قدس سرہ تھے۔ اس بنیاد پر حضرت بنوریؒ اور ان کے ادارہ سے ایک قلبی

محبت ضرور تھی، لہذا میری کوشش ہوتی تھی کہ جب بھی دیوبند سے کراچی آنا ہوتا تو قیام جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں کرتا، چنانچہ اس مرتبہ بھی اسلام آباد سے کراچی پہنچ کر ایک دن کے لیے جامعہ ہی میں قیام کیا۔

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی میں احقر کے قیام کے دوران دارالعلوم دیوبند کی نسبت کی وجہ سے حضرت مولانا سید رشید الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ - امام و خطیب جامع مسجد علامہ بنوری ٹاؤن - (متوفی ۱۴۲۱ھ) وقتاً فوقتاً مغرب یا فجر کی نماز پڑھانے کے لیے مجھے حکم دے دیا کرتے، چنانچہ ۳۰ محرم ۱۴۰۸ھ بروز جمعہ بھی فجر کی نماز پڑھانے کا مجھے حکم دے دیا گیا، نماز و دعا سے فارغ ہونے کے بعد حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی قدس سرہ - فاضل دارالعلوم دیوبند و استاذ حدیث و تفسیر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن - (متوفی ۱۴۰۹ھ) جو پہلی صف میں مولوی سید یوسف حسن طاہر صاحب مؤذن مسجد (حال امام و خطیب مسجد) کے بغل میں تشریف فرما تھے، ان سے دریافت فرمانے لگے کہ یہ نماز پڑھانے والا کون ہے؟ انہوں نے میرا تعارف کراتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کی نسبت کا ذکر بھی کر دیا، میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ کر حضرت سے مصافحہ کیا اور دارالعلوم دیوبند کی سفارش پر جامعۃ الملک سعود ریاض میں داخلہ ملنے اور آج ہی بعد نماز جمعہ ریاض روانہ ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے ان سے دعا کی درخواست کی۔ حضرت نے فرمایا کہ: ”جاؤ! لیکن خیال رکھنا کہیں وہاں پر اغواء نہ ہو جاؤ۔“ حضرت مولانا ادریس صاحب قدس سرہ کی یہ مخلصانہ، مختصر اور جامع نصیحت آگے چل کر احقر کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔

کراچی سے ریاض روانگی

۳۰ محرم ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۸۷ء بروز جمعہ نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر کراچی ایئرپورٹ پہنچ کر تقریباً چھ بجے شام کو بذریعہ سعودی ایئرلائنز ریاض روانہ ہوا، اور تقریباً تین گھنٹے میں سعودی عرب کے وقت کے مطابق شام سات بجے ریاض ایئرپورٹ پہنچ گیا، جہاں مغرب کی نماز پڑھ کر سیدھا جامعۃ الملک سعود پہنچ کر اپنی آمد سے جامعہ کے ذمہ داروں کو آگاہ کر دیا جنہوں نے قیام و دیگر ضروریات کا فوری طور پر انتظام کر دیا۔ احقر کا داخلہ ”وحدة اللغة والثقافة“ میں ہوا تھا جو کہ معهد اللغة العربية کے تین شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے۔ ایک ہفتہ رہائش کے انتظام، تعلیمی درسگاہوں کی تعیین، ضروری اور قانونی کاغذات کی فراہمی میں خرچ ہوا۔ اس ابتدائی ہفتہ میں دو مرتبہ اپنے استاذ و مرشد حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی قدس سرہ کو اور ایک مرتبہ حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری^(۱) مدظلہم کو خواب میں دیکھا جس سے یہ امید قائم ہو گئی کہ اپنے بڑوں کی دعائیں اور توجہات شامل ہیں۔

بروز ہفتہ ۸ / ماہ صفر ۱۴۰۸ھ تعلیم کا آغاز ہوا، میں اپنے اسباق میں تو برابر حاضری دیتا رہا، البتہ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے دل کی بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا رہا:

منزلِ دوست چوں شود نزدیک
آتشِ شوق تیز تر گردد

(۱) ہفتہ کی شب ۲۳ شعبان ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰ مئی ۲۰۱۷ء کو حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری

اور صورت حال یہ تھی کہ جامعۃ الملک سعود کی تحریری اجازت کے بغیر ہم ریاض سے باہر نہیں جاسکتے تھے، اور تعلیمی ایام میں جامعہ کی طرف سے اجازت ملنا دشوار تھا، لہذا اسی بے چینی کی کیفیت میں تقریباً ڈیڑھ مہینہ گزر گیا، بالآخر ایک مختصر وقت کے لیے عمرہ کی ادائیگی کی غرض سے جامعہ سے تحریری اجازت نامہ حاصل کرنے میں بحمد اللہ! کامیابی ہوئی اور ہم لوگ چار ساتھی جن میں سے ایک مولوی محمد اشرف علی صاحب جن کا تعلق سرگودھا پاکستان سے تھا اور آج کل جامعہ اسلامیہ محمودیہ سرگودھا کے مہتمم ہیں، دوسرے مولوی عبدالستار صاحب جن کا تعلق لودھراں ملتان سے تھا، تیسرے جناب دوست محمد صاحب جن کا تعلق سرگودھا سے تھا اور چوتھا راقم السطور تھا۔ ہم نے مل کر ایک کار کرایہ پر لی اور بروز منگل ۱۷/ربیع الاول ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۹۸۷ء جامعۃ الملک سعود ریاض سے حرمین شریفین کی پہلی حاضری کے ارادہ سے اپنی پوری زندگی کے اس یادگار سفر پر روانہ ہو گئے۔ راستہ میں اس تصور سے کہ ہم ان شاء اللہ! عنقریب کعبۃ اللہ (حرسہا اللہ) کی زیارت اور روضہ رسول (ﷺ) پر حاضری کی سعادت سے بہرہ ور ہونے والے ہیں، ہماری کیفیت ایسی ہو جاتی کہ اس کو تحریر میں لانا میرے کمزور قلم کے بس سے باہر ہے۔

واضح رہے کہ میرے مذکورہ تینوں ساتھیوں کو ”چنیوٹ“ صوبہ پنجاب پاکستان میں واقع حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی رحمہ اللہ کے مدرسہ ”ادارۃ الدعوة والارشاد“ کی معرفت سے جامعۃ الملک سعود میں داخلہ ملا تھا، اور حرمین شریفین کی زیارت سے یہ حضرات بھی پہلی بار مشرف ہو رہے تھے، اس لیے ہم سب کی کیفیت تقریباً یکساں تھی۔

مرکز تجلیات کی پہلی زیارت

بہر صورت! ہم لوگ منگل اور بدھ کی درمیانی شب مکہ مکرمہ پہنچے اور تقریباً رات کے دو بجے ذرا فاصلہ سے مسجد حرام کے مبارک میناروں کی زیارت ہوئی، اور یہ تصور قائم رہا کہ یہ وہ مسجد حرام ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار فرمایا ہے، اور ہمیں ان شاء اللہ! چند ہی منٹ بعد اس مبارک مسجد کے اندر حاضر ہونے اور کعبۃ اللہ کی زیارت کرنے کا موقع ملنے والا ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور تھوڑی دیر بعد ہم دنیا کی اس جنت میں پہنچ کر کعبۃ اللہ کی زیارت سے مستفیض ہونے لگے، ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ ہم کعبۃ اللہ کی اس پہلی زیارت اور عمرہ کی ادائیگی سے رات کے اس حصے میں فیض یاب ہو رہے تھے جس میں حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنی خاص شانِ رحمت کے ساتھ بندوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور خود ہی ان کو دعا اور سوال و استغفار کی ترغیب دیتا ہے، حدیث نبوی ملاحظہ ہو:

”عن أبي هريرة- رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ينزل ربنا تبارك وتعالى كل ليلة إلى السماء الدنيا حين يبقى ثلث الليل الآخر، فيقول: من يدعوني فأستجيب له؟ من يسألني فأعطيه؟ من يستغفرني فأغفر له؟“ (متفق عليه)

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارا مالک اور رب تبارک و تعالیٰ ہر رات کو جس وقت آخری تہائی رات باقی رہ جاتی ہے سماء دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے، اور ارشاد فرماتا ہے: کون ہے جو مجھ سے دعا کرے، تاکہ میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مانگے،

تاکہ میں اس کو عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مغفرت چاہے، تاکہ میں اس کو بخش دوں؟۔“
(صحیح بخاری و مسلم)

غور کیا جائے! مسجد حرام کی فضا ہو، مرکزِ تجلیات سامنے ہو، حجرِ اسود کو بوسہ دینے اور کعبۃ اللہ کے ارد گرد طواف کرنے کا وقت آ گیا ہو، ملتزم سے لپٹنے اور ربّ کعبہ کے سامنے اپنی معروضات پیش کرنے کا ایک بہترین موقع مل رہا ہو، آبِ زمزم کے ذریعہ ظاہری اور روحانی طور پر سیراب ہونے کی سہولت میسر ہو رہی ہو، اور حسن اتفاق سے رات کا وہ حصہ چل رہا ہو جس میں اللہ تعالیٰ خود اپنے عاجز بندے کو دعا، سوال اور استغفار کرنے کی دعوت دے رہا ہو، اور ہو بھی کعبۃ اللہ کی پہلی زیارت، جس کی تمنا میں سالوں سال بیت چکے ہوں! ایسے ماحول میں زائر کی کیا کیفیت ہوگی؟ اس سوال کا جواب مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ اس کی تمام پریشانیاں کا فور ہو جاتی ہیں اور دل کو ایک ایسا سکون ملتا ہے جس کو تحریر میں پوری طرح بیان نہیں کیا جاسکتا:

ذوقِ ایں مئے نہ بدانے بخدا تا نہ چشے

اور زائر کا دل زبانِ حال سے اس کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمین است و ہمین است و ہمین است

اور دنیا کی اس رحمت کو سامنے رکھتے ہوئے آخرت کی جنت اور جنت والوں

کی اُس کیفیت کو بھی یاد کر لیتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیتِ کریمہ میں

ذکر فرمایا ہے:

”وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ اِنَّ رَبَّنَا

(الفاطر: ۳۴)

لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ“

ترجمہ: ”اور جنت والے (جنت میں داخل ہونے کے بعد) کہیں گے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا، بے شک ہمارا پروردگار بخشنے والا قادر دان ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مذکورہ بالا کیفیت کے ساتھ ہم لوگ فجر کی اذان سے پہلے عمرہ کی ادائیگی سے فارغ ہو گئے، تھوڑی دیر بعد حرمِ پاک کی پُر کیف فضا میں فجر کی اذان دلوں کو جھنجھوڑنے لگی، جس کی تکبیروں سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور شہادتِ مبین سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کا اعلان ہو رہا تھا: **حي على الصلوة، حي على الفلاح اور الصلوة خير من النوم** سے نماز کی اہمیت اُجاگر ہو رہی تھی اور نماز و کامیابی کی طرف آگے بڑھنے کی دعوت دی جا رہی تھی، حرمِ پاک کی درودیوار سے ٹکرا کر اذان کے یہ کلمات جب کانوں میں پہنچتے تو غفلت میں ڈوبے ہوئے قلوب کو جگا دینے کے لیے کافی ہو جاتے، اذان و نماز کے درمیان وقفہ کے اندر فجر کی دو سنتیں پڑھنے اور اس بات پر غور کرنے کا موقع ملا کہ تھوڑی دیر کے بعد جس مسجد میں باجماعت نماز شروع ہونے والی ہے، وہ اُن تین مساجد میں سے ایک ہے جن کے لیے صحیح حدیث کے مطابق رختِ سفر باندھنے کی اجازت دی گئی ہے، اور جن میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب دوسری مساجد کی ایک کثیر تعداد نمازوں سے زیادہ بتایا گیا ہے، اسی پر غور کرتے ہوئے نگاہیں کعبۃ اللہ کے مبارک منظر سے محظوظ ہو رہی تھیں، تھوڑی دیر کے بعد فجر کی نماز امامِ حرم کی اقتداء میں شروع ہو گئی، اور روئے زمین کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے مہمانانِ حرم نے کعبۃ اللہ کے ارد گرد صفیں باندھ کر کندھوں سے

کندھے ملا دیئے، جب تلاوتِ قرآن شروع ہوئی تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسا کہ قرآن کا نزول ہو رہا ہو اور دل یہ چاہ رہا تھا کہ یہ تلاوت جلدی ختم نہ ہو، نمازِ فجر کے بعد دوپہر تک آرام کیا، اور دوپہر کو اٹھ کر پہلے کھانا کھایا اور پھر حرمِ حاضری ہوئی، ظہر سے عصر تک حرم میں رہے اور عصر کے بعد ہم سب ساتھیوں نے غارِ حرا جانے کا پروگرام بنایا۔

غارِ حراء کی زیارت

مسجدِ حرام سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر منیٰ جاتے ہوئے بائیں طرف ایک پہاڑ ”جبلِ نور“ کے نام سے واقع ہے، اس پہاڑ کی چوٹی پر غارِ حراء ہے، جہاں سید الکونین ﷺ نے نبوت ملنے سے کچھ ہی عرصہ پہلے خلوت گزینی اختیار فرمائی تھی، آپ ﷺ کھانے پینے کا کچھ ضروری سامان ساتھ لے کر تشریف لے جاتے، اور کئی کئی دن خلوت فرماتے، ”الدر المختار“ (ج: ۱، ص: ۲۶۳) کی تصریح کے مطابق غارِ حراء میں آپ ﷺ دینِ ابراہیمی کے مطابق عبادت فرماتے، اور جب سامان ختم ہو جاتا تو واپس تشریف لاتے اور کچھ ضروری سامان لے جاتے اور پھر خلوت گزینی اختیار فرماتے، غارِ حراء کا سائز اتنا ہی ہے کہ کوئی معقول قد کا آدمی تنہا اس میں بیٹھ سکتا ہے، لیٹ سکتا ہے اور کھڑا بھی ہو سکتا ہے، اس غار کے بند دہانے میں ایک عمودی پتلی سی درز ہے، جس سے اُس زمانے میں کعبۃ اللہ صاف نظر آتا تھا، البتہ آج کل مسجدِ حرام کی اونچی عمارت کی وجہ سے کعبۃ اللہ تو نظر نہیں آتا، مسجدِ حرام کی عمارت نظر آتی ہے۔

غارِ حراء میں آپ ﷺ کی خلوت گزینی کا سلسلہ جاری تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبریل علیہ السلام پہلی وحی لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: ”اقراء“ (پڑھیے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ: میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو پڑھنا جانتے ہیں، حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو دبوچا اور خوب دبوچا، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی قوت جواب دینے لگی، پھر چھوڑ دیا اور کہا: ”اقراء“ (پڑھیے) آپ ﷺ نے پھر وہی جواب دیا، حضرت جبریل علیہ السلام نے پھر اسی طرح دبوچا اور پھر چھوڑ کر کہا: ”اقراء“ (پڑھیے) آپ ﷺ کا جواب پھر بھی وہی رہا، حضرت جبریل علیہ السلام نے جب تیسری مرتبہ اُسی طرح دبوچا اور پھر چھوڑ دیا تو کہا: ”اقراء باسمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اقراء وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ“ آپ ﷺ کے اندر تحمل وحی کی استعداد پیدا ہو چکی تھی، آپ ﷺ نے پڑھنا شروع کر دیا اور یہیں سے وحی کا سلسلہ شروع ہوا، جو آپ ﷺ کی وفات تک جاری رہا۔

بہر صورت! غارِ حراء کی زیارت کے لیے ہم چاروں ساتھی بروز بدھ ۱۸/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۱ نومبر ۱۹۸۷ء بعد العصر جبل نور پہنچ گئے، اور پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا، پہاڑ کی چڑھائی درمیان تک زیادہ کٹھن نہ تھی، درمیانی بلندی سے اوپر پہاڑ کی چوٹی تک جانے میں بڑی احتیاط و ہمت کی ضرورت تھی، اس لیے کہ پہاڑ کے ایسے حصوں سے بھی گزرنا پڑتا جہاں چڑھنے والا اپنا جسم تر چھا کر کے پنچوں اور پاؤں کی مدد سے آگے سرکتا ہوا بڑھ سکتا تھا، احقر کے دل میں یہ احساس موجزن تھا کہ جن پتھروں کو آج ہم چھو رہے ہیں یہ وہی پتھر تو ہیں جن کو تقریباً چودہ

سواکتیس سال قبل (۱۴۰۸ھ کے اعتبار سے) نبی کریم ﷺ نے چھوٹا تھا، اور جن پر آپ ﷺ کی مبارک نظریں ضرور پڑی ہوں گی اور اس پر بھی غور کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ نبی کریم ﷺ تو سنِ کہولت میں اس دشوار گزار پہاڑی کی چوٹی پر واقع غارِ حراء تک بار بار تشریف لے جا چکے ہیں، اور آپ ﷺ کے امتی ہونے کا دعویدار یہ سیاہ کار اپنی جوانی (میری عمر اس وقت چھبیس سال کے لگ بھگ تھی) میں ہمت ہار کر صرف ایک مرتبہ چڑھنے میں بھی کاہلی سے کام لے تو یہ ہرگز مناسب نہیں، شاید اسی احساس و جذبے نے احقر کو اپنے ساتھیوں سے پہلے اور راستے میں توقف کیے بغیر غارِ حراء تک پہنچا دیا۔

اس تاریخی سفر کے بعد سے تادم تحریر جو تقریباً اٹھائیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اپنے رفیق سفر جناب مولانا محمد اشرف علی صاحب سے وقفہ وقفہ سے دو ملاقاتیں اور ایک مرتبہ فون پر بات ہوئی ہے، تینوں دفعہ انہوں نے جبل نور پر احقر کے چڑھنے کے انداز کا تذکرہ ضرور فرمایا ہے، غارِ حراء میں کم از کم دو رکعت نفل نماز ادا کرنے کو دل چاہ رہا تھا، لیکن چونکہ ہم لوگ عصر پڑھ کر نکلے تھے، اس لیے نوافل کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے یہ تمنا پوری نہ ہو سکی، اور زیارت و دعاؤں پر اکتفاء کرتے ہوئے ہم لوگ واپس ہو گئے۔

غارِ حراء کی زیارت سے تین باتوں کا ذہن نشین ہو جانا

غارِ حراء کا دشوار گزار راستہ طے کرنے اور اس کی زیارت کرنے کے موقع

پر تین باتیں خاص طور پر ذہن نشین ہو گئیں:

پہلی بات: ہر داعیِ حق، عالمِ دین اور خادمِ اسلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے نبی ﷺ کے غارِ حراء جانے کے لیے جبلِ نور پر بار بار چڑھنے کی مشقت کو سہنے اور اس کے بعد ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی میں گونا گوں تکالیف جھیلنے اور مخالفین کی اذیتوں پر صبر کرنے کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی میں مشقت برداشت کرنے، محنت کرنے اور سادگی اختیار کرنے کو ترجیح دے، تاکہ وہ دعوت و تبلیغ، دینی علوم کی تعلیم اور آوازِ حق پھیلانے کے لیے درکار محنت کا عادی بن کر مخالفین کی اذیتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار رہے، اور اگر خدا نا خواستہ اس نے اپنے نبی ﷺ کے طریقہ کو چھوڑ کر دنیا داروں اور تعیش پرستوں کے طرزِ زندگی کو اختیار کیا اور آرام طلبی و سہولت پسندی اس کے مزاج میں داخل ہو گئی تو ایسی صورت میں نہ تو وہ دینی تعلیم و تبلیغ کے لیے بے لوث محنت کر سکے گا، اور نہ ہی مخالفین کی اذیتوں پر صبر کرنے کا مادہ اپنے اندر پائے گا، اور بالآخر دنیا داروں اور سہولت پسندوں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا۔ والعیاذ باللہ۔

دوسری بات: ایک عام مسلمان اور بالخصوص عالمِ دین و داعیِ حق کے لیے چاہیے کہ اپنے نبی ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے کھانے پینے میں احتیاط برتے، تاکہ جسمِ فریبہ نہ ہونے پائے اور پیٹ اپنے حدود میں رہے، اس لیے کہ جسمِ فریبہ ہونے اور پیٹ باہر کی طرف نکلنے کی صورت میں تگ و دو مشکل ہوتی ہے، اور بوقتِ ضرورت دشوار گزار راستوں کو عبور کرنا اور اونچائیوں پر چڑھنا دشوار ہو جاتا ہے، آقائے نامدار ﷺ کا بار بار جبلِ نور پر چڑھنا اور کئی کئی دن تک کھانے پینے کے ایک معمولی سامان پر اکتفا کرنا اس بات کی واضح علامت ہے کہ آپ ﷺ کا

جسم مبارک چست، موزوں اور اپنے کنٹرول میں تھا، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ہند بن ابی صالحہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حلیہ مبارک نقل کیا ہے، اس میں یہ بھی ہے: ”سواء البطن والصدر“ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیٹ اور سینہ مبارک دونوں ہموار تھے، اور اسی روایت میں آگے یہ لفظ بھی ہے: ”ذریع المشیة“ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیز رفتار تھے۔ (شماں ترمذی، ص: ۲)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح البخاری کے اندر حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث نقل کی ہے جس میں بعد میں آنے والے ایسے لوگوں کا تذکرہ ہے جو خیانت اور دیگر گناہوں میں مبتلا ہوں گے اور ان کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ ان میں موٹاپا ظاہر ہو جائے گا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

”إِنَّ بَعْدَكُمْ قَوْمًا يَخُونُونَ وَلَا يُؤْتَمَنُونَ وَيَشْهَدُونَ وَلَا يُسْتَشْهَدُونَ وَيَنْذَرُونَ وَلَا يُنْذَرُونَ وَيُظْهَرُ فِيهِمُ السَّمَنُ“
 ”بے شک تمہارے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو خیانت کریں گے اور امانت داری سے کام نہیں لیں گے، اور گواہی دیں گے جب کہ وہ گواہ نہیں بنائے گئے ہوں گے، اور متنبس مانیں گے اور انہیں پوری نہیں کریں گے، اور ان میں موٹاپا ظاہر ہو جائے گا۔“

مذکورہ حدیث کی تشریح میں بخاری شریف کے حاشیہ کے اندر کرمانی کے حوالہ

سے لکھا ہوا ہے:

”یعنی لوگوں کی زندگی کا مقصد صرف کھانا پینا اور دنیوی خواہشات کے پیچھے چلنا رہ جائے گا، آخرت سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہوگا۔“

راقم عرض کرتا ہے کہ ایسے لوگوں پر سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا مندرجہ ذیل شعر

بھی منطبق ہوتا ہے:

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است
ایں معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

تیسری بات: مصلحین امت و مشائخ طریقت نے مدارج سلوک طے کرنے اور روحانی ترقی حاصل کرنے کے لیے چلہ کشی اور گوشہ نشینی کو جو اہمیت دی ہے، اُس اہمیت پر غارِ حراء کے واقعہ سے استدلال کیا جاسکتا ہے، چنانچہ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۵۰۵ھ) نے اپنی مایہ ناز کتاب ”احیاء علوم الدین“ جلد ثانی میں گوشہ نشینی کی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے اس کے چھ فوائد ذکر کیے ہیں، اور فائدہ اولیٰ کو بیان کرتے ہوئے اس کے ضمن میں غارِ حراء کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت و گوشہ نشینی سے استدلال فرمایا ہے۔

اسی طرح حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری شیخ الحدیث و صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند مدظلہم العالی نے تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری جلد اول، ص: ۱۳۹ پر خلوت گزینی کی افادیت کو بیان کرتے ہوئے اپنے شیخ حضرت مولانا زکریا صاحب قدس سرہ کا یہ ملفوظ نقل فرمایا ہے:

”جس نے لوگوں سے دوری اختیار کی اور تنہائی کو پسند کیا وہ اگر ٹھیکری (مٹی کے برتن کا بے وقعت ٹکڑا) بھی ہوگا تو ہیرا بن جائے گا، اور جو لوگوں کے ساتھ تعلقات کا خواہاں ہوتا ہے اور یارا نہ گانٹھنے کا شوقین ہوتا ہے وہ اگر ہیرا بھی ہوگا تو ٹھیکری بن جائے گا۔“

غارِ حراء کی زیارت سے فارغ ہو کر ہم لوگ واپس مسجدِ حرام آ گئے، اور چونکہ

اگلے دن ہی مدینہ منورہ جانا تھا، اس لیے کوشش یہ رہی کہ جو مختصر وقت ہمارے پاس ہے اس کا بیشتر حصہ مسجد حرام کی بابرکت فضاء میں گزر جائے، چنانچہ پوری رات مسجد حرام میں رہے، اور اگلے دن مدینہ منورہ جانے کا پروگرام بنایا۔

کعبۃ اللہ کا الوداعی طواف

ہمیں چونکہ بہت مختصر وقت کے لیے جامعۃ الملک سعود ریاض سے عمرہ اور زیارتِ حرمین شریفین کے لیے تحریری اجازت نامہ ملا تھا، جس کے تحت ہم بروز منگل ۱۷/ربیع الاول کو ریاض سے روانہ ہو گئے تھے، اور بروز ہفتہ ۲۱/ربیع الاول کو واپس ریاض پہنچ کر جامعہ میں صبح کے وقت اپنے اسباق میں حاضری دینی تھی، اس مختصر وقت میں ہمیں عمرہ بھی کرنا تھا، اور مدینہ منورہ جا کر مسجد نبوی اور روضہ اقدس پر حاضری بھی دینی تھی، اس لیے بروز جمعرات ۱۹/ربیع الاول ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۲/نومبر ۱۹۸۷ء رخصت ہونے کے ارادہ سے کعبۃ اللہ کا طواف کر کے ملتزم پر آ کر حزن و ملال اور اس دعا کے ساتھ رخصت ہوئے کہ:

”یا اللہ! یا مجیب الدعوات! بار بار صحت و عافیت، ایمان و یقین اور استقامت و

مخلصانہ محبت کے ساتھ حاضری کی توفیق عنایت فرما۔“

حرمین شریفین کی زیارت کے لیے بچپن سے جو تمنائیں دل میں موجزن تھیں ان تمنائوں کی تکمیل اگرچہ اتنے مختصر وقت میں نہیں ہو سکتی تھی اور ہمیں ایک مختصر حاضری کے بعد دوبارہ فراق و جدائی کا حزن و ملال لاحق تھا، اور دل میں ایک بے چینی کی کیفیت تھی، اس بے چینی کی کیفیت میں احقر کبھی اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتا کہ تم اتنے مختصر وقت میں کیوں واپس جا رہے ہو؟ ادھر سے جواب ملتا کہ جب

وقت ہی مختصر ملا تو اب کیا کہا جاسکتا ہے؟ میرے اس ”مکالمہِ نفسی“ پر حافظ شیرازی کا مندرجہ ذیل شعر منطبق ہو رہا تھا:

گفتم کہ نہ وقتِ سfert بود چنین روز
گفتا کہ مگر مصلحتِ وقت چنین بود

درِ فراق کی وجہ سے اگرچہ ہمیں غیر اختیاری ملال لاحق تھا، تاہم اللہ تعالیٰ کے اس عظیم انعام پر کہ اس نے اپنے دربار میں حاضری، کعبۃ اللہ کی زیارت اور طواف اور غلافِ کعبہ پکڑنے کا موقع عنایت فرمایا ہے، ہمارے قلوب غمِ فراق کے ساتھ ساتھ شکرِ خداوندی کے جذبات سے بھی لبریز تھے، اور بقول شاعر ہماری کیفیت کچھ اس طرح بھی تھی:

نازمِ بچشمِ خود کہ جمالِ تو دیدہ است اتم بہ پائے خود کہ بہ کویت رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ دہم دستِ خویش را کو دامت گرفتہ بہ سویم کشیدہ است

ترجمہ و مفہوم: ”مجھے اپنی آنکھوں پر فخر ہے جنہوں نے آپ کے جمال کا نظارہ کیا ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ ہر گھڑی اپنے ہی ہاتھوں کو ہزاروں بوسے دیا کروں، کیونکہ انہوں نے آپ کا دامن پکڑ کر میری طرف سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔“

مدینہ منورہ روانگی

بروز جمعرات کعبۃ اللہ کا الوداعی طواف کرنے کے بعد مدینہ منورہ کی حاضری کے ارادہ سے ہم چاروں روانہ ہو گئے، راستہ میں کبھی یہ تصور قائم ہوتا کہ حرمین شریفین کے درمیان کا راستہ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے یارِ غار و رفیقِ سفر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت میں ہجرت فرماتے ہوئے کتنی مشقت کے ساتھ طے کیا تھا! اور آج ان کی قربانیوں کی بدولت وہی راستہ ہم لوگ کتنی آسانی

اور امن و امان کی فضا میں طے کر رہے ہیں! ان نعمتوں کا شکر ہم کیسے ادا کریں گے! اور کبھی ان پہاڑیوں اور ریگستانوں کو جو اپنی پرانی حالت پر باقی تھے اور نئے نئے روڈوں اور جدید تعمیرات نے ان کے حلیہ کو متاثر نہیں کیا تھا، اس وجہ سے ہم خصوصی طور پر محبت و عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے کہ شاید مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان آتے جاتے ان پر نبی کریم ﷺ یا آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مبارک قدموں کے نشانات یا مبارک نظریں پڑی ہوں گی، ان ہی تصورات کے ساتھ جیسے جیسے ہم لوگ آگے بڑھتے رہتے، شوقِ مدینہ میں اضافہ ہوتا رہتا:

کسی چیز کی اس کو حسرت نہیں ہے
میسر ہو جس کو غبارِ مدینہ

مسجدِ قبا کی زیارت اور اس کا ذکرِ خیر

ہم لوگ حسبِ توفیق درود شریف کا ورد کرتے ہوئے مندرجہ بالا تصورات کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف والہانہ انداز میں بڑھ رہے تھے، یہاں تک کہ عصر تک محلہ ”قبا“ میں پہنچ کر عصر کی نماز ”مسجدِ قبا“ میں ادا کی، قبا نبی کریم کے دور میں مدینہ منورہ کی بالائی جانب تقریباً تین میل کے فاصلہ پر واقع ایک گاؤں کا نام تھا، جہاں قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے لوگ آباد تھے، اب وہ مدینہ منورہ میں شامل ہو گیا ہے، بخاری شریف جلد اول، صفحہ نمبر: ۵۵۹ تا ۵۶۰ کی روایت کے مطابق آپ ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں داخل ہونے سے قبل یہاں پر قیام فرمایا تھا، اور چودہ دن رہے تھے، بخاری شریف جلد اول، صفحہ: ۵۵۵ کی ایک اور روایت کے مطابق آپ ﷺ نے اسی دوران اُس مسجد (مسجدِ قبا) کی بنیاد

رکھی، جس کے بارہ میں (قرآن پاک کے اندر) فرمایا گیا ہے: ”أُسَسَّ عَلَى التَّقْوَى“ یعنی وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ”البدایۃ والنہایۃ“ جلد ثانی، صفحہ: ۵۹۹ پر ایک حدیث کے حوالہ سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس مسجد میں جانبِ قبلہ کی نشاندہی نبی کریم ﷺ کے سامنے حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمائی تھی، اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں عام مسلمانوں کے لیے سب سے پہلے یہی مسجد بنائی گئی، ہاں! ایک مسجد اس سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں اپنے گھر کے دروازہ کے پاس ضرور بنائی تھی، لیکن وہ صرف اپنی ذاتی عبادت کے لیے تھی، عام مسلمانوں کے لیے نہیں تھی، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس مسجد کا تذکرہ بخاری شریف کی روایت میں صفحہ: ۵۵۳ جلد اول میں بھی موجود ہے۔

حاصل یہ! کہ ”مسجدِ قباء“ عام مسلمانوں کے لیے بنائی گئی سب سے پہلی مسجد ہے، اور نبی کریم ﷺ نے خود اس کی بنیاد رکھی ہے، اور اس کی تعمیر میں بھی حصہ لیا ہے، اس مسجد کا ذکر خیر قرآن پاک سورہ توبہ آیت: ۱۰۸ میں بھی موجود ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ ﷺ ہر ہفتہ کے دن کبھی سواری پر اور کبھی پیدل ”مسجدِ قباء“ تشریف لے جایا کرتے تھے، اور نبی کریم ﷺ کی اتباع میں خود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی ہر ہفتہ کے دن ”مسجدِ قباء“ تشریف لے جایا کرتے تھے، اور وہاں پر دو رکعت نماز ادا کرتے تھے۔ (بخاری شریف، ج: ۱، ص: ۱۵۹)

اسی طرح امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابن ماجہ رحمہم نے حضرت اُسید بن

ظہیر انصاری اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہما کی روایت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

”مسجدِ قباء کی نماز کا ثواب عمرہ کے ثواب کے برابر ہے۔“

(ترمذی، ج: ۱، ص: ۷۴۔ نسائی، ج: ۱، ص: ۱۱۴۔ ابن ماجہ: ۱۰۲)

مسجدِ قباء کے مذکورہ بالا فضائل کو سامنے رکھتے ہوئے جمہور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ مسجدِ حرام، مسجدِ نبوی اور مسجدِ اقصیٰ کے بعد تمام مساجد میں سب سے افضل مسجدِ قباء ہے، ہم سب رفقاء سفر کو اس بات پر خوشی تھی کہ ہمیں اس مسجد کی زیارت اور اس میں نماز پڑھنے کی سعادت ملی، اور خود بخود ایک ایسی صورت بن گئی کہ ہمیں مسجدِ نبوی کے حدود تک پہنچنے سے قبل مسجدِ قباء کے حدود میں عصر کی نماز کی ادائیگی کے لیے رُکنا پڑا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ ہجرت کے ساتھ ایک ادنیٰ شبابہت کی صورت پیدا ہو گئی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں داخل ہونے سے پہلے یہاں قیام فرمایا تھا۔

مسجدِ قباء سے مسجدِ نبوی کی حاضری کے لیے روانگی

عصر کی نماز اور مسجدِ قباء کی زیارت سے فارغ ہو کر ہم مسجدِ نبوی کی طرف روانہ ہو گئے، تھوڑی دیر کے بعد مسجدِ نبوی کے پُر نور میناروں اور مزید آگے چل کر باعظمت گنبدِ خضراء پر نظریں جم گئیں، دل دھڑکنے اور آنسو ٹپکنے لگے، اور آگے چونکہ مسجدِ نبوی اور روضہ اقدس پر حاضری کا مرحلہ تھا، تو کبھی اس سوچ کا غلبہ ہو جاتا کہ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے مواجہہ شریف پر اپنی بد اعمالیوں اور اپنے گناہ گار و خطا کار چہرے کے ساتھ حاضری دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا، لہذا! اقدامِ عالیہ

کی جانب سے اپنی نظریں چھپا کر سلام پیش کرنا میرے حق میں مناسب ہوگا، پھر یہ خیال آتا کہ آپ ﷺ تو اپنی جان کے دشمنوں تک کو بھی معاف فرماتے تھے، اور آپ ﷺ کی مجلس میں بیٹھنے والوں میں سے ہر شخص آپ ﷺ کے اچھے سلوک و بلند اخلاق کو دیکھ کر یہ تصور کرتا کہ شاید آپ ﷺ سب سے زیادہ مجھ سے محبت فرماتے ہیں، اور خود رب العزت نے آپ ﷺ کے حق میں سورہ توبہ آیت: ۱۲۸ میں ارشاد فرمایا ہے:

”حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَحِيمٌ“

ترجمہ: ”وہ تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند رہتے ہیں اور مسلمانوں پر نہایت شفقت کرنے والے مہربان ہیں۔“

اسی طرح سورہ نساء آیت نمبر: ۶۴ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا“

ترجمہ: ”اور جب لوگوں نے (تمہاری نافرمانی کر کے) اپنے اوپر ظلم کیا تھا، اگر اسی وقت تمہارے پاس حاضر ہو جاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول (ﷺ) ان کے لیے بخشش طلب کرتے تو یہ لوگ دیکھ لیتے کہ اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔“

آیت مذکورہ کے حکم کا تعلق اگرچہ براہِ راست تو کسی ایسی جماعت سے ہے جو آپ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھی، تاہم اربابِ علم اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح آپ ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کے مزارِ اقدس پر حاضری دینے والوں سے بھی جوڑ دیتے ہیں، یہاں تک کہ مشہور مفسر و محدث حافظ عماد الدین

اسماعیل بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۷۷ھ) نے اپنی مایہ ناز تفسیر میں آیت مذکورہ کے تحت ”عتبی“ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مشہور قصہ نقل کیا ہے:

”میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے مزارِ اقدس کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صحرا نشین شخص آیا اور ”السلام علیک یا رسول اللہ!“ کہہ کر عرض کرنے لگا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا ہے، جو فرماتے ہیں: ”وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاؤُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا“ اور میں اپنے گناہوں پر استغفار کرتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور اپنے پروردگار کے حضور میں آپ سے شفاعت کی التجاء کرتا ہوں۔ پھر مندرجہ ذیل دو نعتیہ شعر پڑھ کر چلا گیا:

یاخیر من دفنت بالقاع أعظمه فطاب من طيهن القاع و الاکم
نفسی الفداء لقبر أنت ساکنه فيه العفاف وفيه الجود و الکرم

ترجمہ: ”اے ان تمام ہستیوں سے برتر ہستی! جن کی ہڈیاں (اجسام مبارکہ)

ہموار زمین میں دفن ہو چکی ہیں، اور ان کی خوشبو سے ہموار زمین و پہاڑیاں مہک

اُٹھی ہیں، میری جان قربان ہو اس قبر پر جس میں آپ آرام فرما رہے ہیں، اس

قبر میں تو پاک دامن اور جو دو کرم سب قیام پذیر ہیں۔“

عتبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ وہ شخص تو چلا گیا اور مجھے نیند آ گئی اور خواب میں نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اے عتبی! اس صحرا

نشین شخص سے جا کر ملو اور یہ خوشخبری سنا دو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت

فرمادی۔“ (تفسیر ابن کثیر، ج: ۱، ص: ۶۳۵، مطبوعہ ریاض)

احقر کہتا ہے کہ اس موقع پر اُس مرفوع حدیث نبوی کی طرف بھی ذہن منتقل ہوا

جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر حاضری دینے

کی ترغیب دی گئی ہے، اور اُس حاضری کو آپ ﷺ کی شفاعت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، مذکورہ حدیث مختلف سندوں کے ساتھ مروی ہے، اور ہر سند پر انفرادی طور پر اگرچہ محدثین نے کلام کیا ہے، تاہم امام ذہبی، ابوعلی بن السکن، تقی الدین سبکی اور شیخ عبدالحق رحمہ اللہ جیسے محدثین نے کثرتِ طرق کی بنیاد پر اس کی اہمیت و مضبوطی کو تسلیم کیا ہے۔

(ملاحظہ ہو: التلخیص الحبیر لابن حجر، ج: ۲، ص: ۵۷۰، مطبوعہ بیروت۔ فیض القدیر شرح الجامع الصغیر للمناوی، ج: ۶، ص: ۱۴۰، مطبوعہ بیروت) مذکورہ بالا وجوہات اور اُمتِ مسلمہ کا قرناً بعد قرن آپ کے مزارِ اقدس پر حاضری دینے کے لیے سفر کرنے کے تعامل کو مد نظر رکھتے ہوئے جمہور علماء نے اس حاضری کو افضل المندوبات اور اعظم القربات بلکہ بعض نے تو (اہل استطاعت کے لیے) واجب قرار دیا ہے۔

(ملاحظہ ہو: معارف السنن للشیخ العلامة البنوری، ج: ۳، ص: ۳۲۹ تا ۳۳۵) خلاصہ یہ کہ مسجدِ قباء اور مسجدِ نبوی کے درمیان کا راستہ طے کرنے کے دوران اپنی کوتاہیوں پر غور کرتا ہوا شروع شروع میں اپنے اندر یہ ہمت نہیں پارہا تھا کہ مسجدِ نبوی میں حاضری کے بعد سلام پیش کرنے کے لیے مواجہہ شریف پر حاضری دوں گا، بلکہ اپنے حق میں یہی بہتر سمجھتا تھا کہ اقدامِ عالیہ کی جانب سے سلام پیش کروں گا، لیکن جب مندرجہ بالا امور کا اجمالی طور پر ذہن میں استحضار ہوا تو کچھ ہمت سی پیدا ہوگئی، اور یہ بات ذہن نشین ہونے لگی کہ اپنی زیادتوں اور بد اعمالیوں کے باوجود نبی کریم ﷺ جن کی صفت ”حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ“ ہے۔ کے دربارِ عالی میں شرمندگی و ندامت کے احساس کے ساتھ مواجہہ شریف کی جانب سے حاضر ہونا مناسب رہے گا۔

روضہ مبارک پر حاضری اور سلام پیش کرنے کی سعادت

روضہ اقدس پر جب مواجہہ شریف کی جانب سے سلام پیش کرنے کا مرحلہ سامنے آیا، اور یہ تصور بھی قائم ہو گیا کہ آج توصیفہ حاضر کے ساتھ صلاۃ و سلام پیش کرنے کا موقع نصیب ہو رہا ہے، اور اس حدیث کا تصور بھی جو امام احمد بن حنبل اور امام ابوداؤد رحمہما اللہ نے مضبوط سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے موقع پر سلام کا جواب بھی عنایت فرماتے ہیں۔

(التلخیص الحبیر، ج: ۲، ص: ۵۷۰)

اس تصور سے دل و دماغ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو گئی جس سے وہ ساری تمنائیں اور حاجتیں ذہن سے غائب ہو گئیں جن کے متعلق چلتے وقت یہ منصوبہ بنایا تھا کہ روضہ اقدس پر حاضری کے دوران سلام پیش کرنے کے بعد ان تمنائوں اور حاجتوں کے حصول کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسل سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کروں گا، اس لیے کہ بارگاہ نبوی میں حاضری کی تمناجب پوری ہو گئی تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ تمام تمنائیں پوری ہو گئیں، اب مزید کسی تمنا کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اُس وقت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر میری کیفیت پر منطبق ہو رہا تھا:

اربابِ حاجتیم و زبانِ سوال نیست

در حضرتِ کریم تمنا چہ حاجت است؟

ترجمہ و مفہوم: ”ہم حاجت مند تو بے شک ہیں، لیکن زبان میں سوال کرنے کی ہمت نہیں رہی، کیونکہ دربارِ کریم میں حاضری کی تمناجب پوری ہو گئی تو مزید کسی تمنا کی ضرورت کیا ہے؟“

بہر صورت! صلوٰۃ و سلام کے کلمات عربی زبان میں ذرا پست آواز کے ساتھ

پیش کرنے کے بعد دل نے چاہا کہ فارسی زبان میں مولانا عبدالرحمن جامی ۷ (متوفی ۸۹۸ھ) کے اس قصیدہ نعتیہ میں سے چند منتخب اشعار پڑھنے کی کوشش کروں جو بتیس اشعار پر مشتمل اور ان کی مشہور و معروف کتاب ”یوسف زلیخا“ کے شروع میں درج ہے، میں نے بچپن میں اپنے والد ماجد قدس سرہ کے پاس ”یوسف زلیخا“ پڑھتے ہوئے وہ قصیدہ پڑھا تھا، اور والد ماجد مجھے پڑھاتے ہوئے یا کبھی خود اسے پڑھتے ہوئے آنسو بھی بہاتے تھے، اس قصیدہ سے متعلق شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے ”فضائل درود شریف“ میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب قدس سرہ کی زبانی ایک قصہ نقل کیا ہے جو نیچے درج کیا جا رہا ہے:

مولانا عبدالرحمن جامی رحمۃ اللہ علیہ کے قصیدہ نعتیہ کا قصہ

”مولانا جامیؒ یہ نعت کہنے کے بعد جب ایک مرتبہ حج کے لیے تشریف لے گئے تو ان کا ارادہ یہ تھا کہ روضہ اقدس کے پاس کھڑے ہو کر اس نظم کو پڑھیں گے، جب حج کے بعد مدینہ منورہ کی حاضری کا ارادہ کیا تو امیر مکہ نے خواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں ان کو یہ ارشاد فرمایا کہ اس کو (جامی کو) مدینہ نہ آنے دیں، امیر مکہ نے ممانعت کر دی، مگر ان پر جذب و شوق اس قدر غالب تھا کہ یہ چھپ کر مدینہ کی طرف چلے، امیر مکہ نے دوبارہ خواب دیکھا! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ آرہا ہے، اس کو یہاں نہ آنے دو، امیر نے آدمی دوڑائے اور ان کو راستہ سے پکڑوا کر بلایا، ان پر سختی کی اور جیل خانہ میں ڈال دیا، اس پر امیر کو تیسری مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: یہ کوئی مجرم نہیں بلکہ اس نے

کچھ اشعار کہے ہیں جن کو یہاں آ کر میری قبر پر کھڑے ہو کر پڑھنے کا ارادہ کر رہا ہے، اگر ایسا ہوا تو قبر سے مصافحہ کے لیے ہاتھ نکلے گا جس میں فتنہ ہوگا، اس پر ان کو جیل سے نکالا گیا اور بہت اعزاز و اکرام کیا گیا۔“

(فضائل درود شریف، ص: ۱۱۲، ۱۱۳)

اس قصیدہ کے چند منتخب اشعار یہ ہیں:

- | | | |
|---|-----------------------------|-----------------------------|
| ۱ | زِ مہجوری برآمد جان عالم | ترحم یامی اللہ! ترحم |
| ۲ | نہ آخر رحمۃ للعالمین | زِ محروماں چرا غافل نشینی |
| ۳ | بروں آور سرا از بُردِ میانی | کہ روئے تُست صبحِ زندگانی |
| ۴ | اگرچہ غرقِ دریائے گناہم | فتادہ خشک لبِ برخاکِ راہم |
| ۵ | تو ابرِ رحمتی آن بہ کہ گاہے | کنی بر حالِ لبِ خشکاں نگاہے |
| ۶ | قضا می افکند از راہ مارا | خدارا از خدا در خواہ مارا |
| ۷ | کہ بخشد از یقیں اول حیاتے | دہد آنگہ بکارِ دیں ثباتے |
| ۸ | کند با ایں ہمہ گمراہی ما | ترا اذنِ شفاعتِ خواہی ما |

ترجمہ و مفہوم:

”۱- آپ کے فراق سے کائناتِ عالم کا ذرہ ذرہ جاں بلب ہے، اے رسولِ خدا! نگاہِ کرم فرمائیے!“

۲- آپ تو رحمۃ للعالمین ہیں، ہم بے نصیبوں سے آپ کیسے تغافل فرما سکتے ہیں؟

۳- اپنے سر مبارک کو یمنی چادروں کے کفن سے باہر نکالے، کیونکہ آپ کا چہرہ انورئی زندگی عطا کرتا ہے۔

۴- اگرچہ میں گناہوں کے دریا میں غرق ہوں، لیکن خشک ہونٹوں کے ساتھ آپ کی گردِ راہ میں پڑا ہوا ہوں۔

۵- آپ چونکہ ابرِ رحمت ہیں، اس لیے بہتر ہوگا کہ کبھی تو تشنہ لبوں پر ایک نگاہِ کرم ڈال دیں۔

۶- تقدیر ہمیں صراطِ مستقیم سے بھٹکا رہی ہے، خدا را! ہمارے لیے خداوندِ قدوس سے دعا فرمائیے!

۷- (دعا یہ فرمائیے) کہ اللہ تعالیٰ اولاً تو ہمیں یقینِ کامل کی زندگی بخشے، اور پھر دینی کاموں میں ثابت قدمی عطا فرمائے۔

۸- (اور یہ بھی دعا فرمائیے) کہ اللہ تعالیٰ ہماری تمام برائیوں کے باوجود آپ کو ہماری شفاعت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائے۔“

اس قصیدے نے چونکہ بچپن ہی سے اپنے والد ماجد کی کیفیت کو دیکھ کر احقر کو متاثر کر دیا تھا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ کبھی دوسروں سے سن کر اور کبھی خود تنہائیوں میں پڑھتے ہوئے اور حضرت شیخ الحدیث قدس سرہ کے نقل کردہ مذکورہ بالا قصہ پر غور کرتے ہوئے اس تاثر میں اضافہ ہوتا رہا، اس پرانی مناسبت نے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ آستانہ سرکارِ دو عالم ﷺ پر حاضری کے وقت اس قصیدے میں سے چند وہ منتخب اشعار جو زبانی یاد ہو گئے تھے پڑھنے کی کوشش کروں، لیکن ہوا یہ کہ صرف ایک دو شعر رُک رُک کر پڑھنے کے بعد زبان گنگ ہو گئی اور مزید پڑھنے سے اپنی عاجزی ظاہر کر دی۔

زباں گنگ کیوں نہ ہوتی؟ جس دربار کی حاضری کو اللہ تعالیٰ کا مقرب فرشتہ حضرت جبریل علیہ السلام اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتا ہو، جس ہستی سے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرمایا ہو کہ:

”اے ایمان والو! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کیا کرو، اور جس طرح

آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو، اس طرح ان کے روبرو زور

سے نہ بولا کرو، (ایسا نہ ہو کہ) تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔“
(الحجرات: ۲)

اور جس ذاتِ اقدس کے دربار میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری ہوتا ہو، اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے متعلق یہاں تک فرمایا ہو کہ: ”إِذَا قَامَ فِي مَقَامِكَ لَمْ يُسْمَعْ النَّاسَ مِنَ الْبَكَاءِ“ یعنی ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تو حالت یہ ہے کہ اگر نماز پڑھانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محراب میں کھڑے ہو گئے تو شدتِ گریہ کی وجہ سے لوگوں کو تکبیر و قرأت سنانے پر قادر نہیں ہو سکیں گے۔ (بخاری شریف، ج: ۱، ص: ۹۳) اور جن کی مجلس میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بات کرتے ہوئے کانپتے ہوں! ان کے آستانے کے سامنے گناہوں کے بوجھ سے لدا ہوا پندرہویں صدی ہجری کے پُرفتن اور دورِ اُفتادہ زمانے کا ایک سیاہ کار شخص کس طرح لب کشائی کر سکتا ہے؟

بشارتِ غیبی کا ایک واقعہ

احقر اس مضمون ”حجازِ مقدس کی والہانہ حاضری“ کو اپنی تحریری اور ذہنی یادداشتوں کی روشنی میں ترتیب دینے لگا تھا اور شروع سے ”روضۂ اقدس پر حاضری اور سلام پیش کرنے کی سعادت“ والے عنوان تک لکھ چکا تھا، اور مذکورہ عنوان کے تحت بھی کچھ حصہ لکھ چکا تھا اور مزید لکھنے میں مصروف تھا کہ اسی دوران بروز منگل ۲۸ / ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۱۳ / اکتوبر ۲۰۱۵ء فجر کی نماز کے بعد اچانک موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی اور اسکرین پر ایک ایسا نمبر ظاہر ہو گیا جو میرے

پاس محفوظ نہ تھا، میری پوری توجہ چونکہ روضہ اقدس پر پہلی حاضری کی یادوں کی طرف مرکوز تھی، اس لیے ایک مرتبہ تو سوچا کہ فون ہی وصول نہ کروں اور اپنی یادوں کے سلسلہ کو ٹوٹنے نہ دوں، پھر خیال آیا کہ یہ تو کسی مسلمان بھائی کے ساتھ نا انصافی ہوگی، لہذا میں نے فون وصول کر کے سلام کیا، ادھر سے جواب کے بعد آواز آئی:

”میں حرمین شریفین کی پہلی حاضری میں آپ کا رفیق سفر محمد اشرف علی سرگودھا سے بول رہا ہوں۔“

یہ سننا تھا کہ میری کیفیت کچھ عجیب سی ہوگئی، اس لیے کہ یہ ان ہی تین رفقائے سفر میں سے ایک تھے جن کا ذکر خیر اس سے پہلے اس مضمون میں کر چکا ہوں، ایک ایسے موقع پر کہ میں حرمین شریفین کی پہلی حاضری سے متعلق تقریباً اٹھائیس سال گزرنے کے بعد مضمون لکھنے میں مصروف تھا اور مواجہہ شریف پر حاضری کا موضوع چل رہا تھا، غیر متوقع طور پر مولانا کی آواز اور ان کی زبان سے حرمین شریفین کا تذکرہ سن کر اُسے فالِ نیک اور بشارتِ غیبی سمجھا، اور مولانا کو اُسی وقت اس صورتِ حال سے آگاہ کر دیا کہ احقر اس وقت مواجہہ شریف پر حاضری کے عنوان کے تحت کچھ لکھ رہا تھا اور آپ میری یادوں میں میرے ساتھ تھے، مولانا نے فرمایا کہ: میں نے اپنی مسجد میں فجر کی نماز پڑھائی، پھر درسِ قرآن دیا، اس کے بعد اُسی جائے نماز پر بیٹھا ہوا نمازِ اشراق کے انتظار میں کچھ وظائف و اوراد پڑھ رہا تھا کہ آپ کی رفاقت میں حرمین شریفین کی پہلی حاضری اور جبلِ نور پر آپ کے چڑھنے کا انداز یاد آیا اور اس یاد نے آپ کو فون کرنے پر مجبور کر دیا، چنانچہ جائے نماز ہی سے آپ کو

فون کر رہا ہوں، اس موقع پر جانبین پر کچھ رقت کی کیفیت بھی طاری ہو گئی، اور ہر ایک نے دوسرے سے دعا کی درخواست پر بات ختم کر دی۔

واضح رہے کہ ماہِ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ کو یہ یادگار سفر ہوا تھا، اور اس کے بعد تادم تحریر تقریباً اٹھائیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اس دوران مولانا سے صرف دو مختصر ملاقاتیں ہو چکی ہیں، اور چند سال قبل ایک مرتبہ فون پر بھی رابطہ ہوا تھا، اس کے بعد نہ تو آپس میں کوئی مستقل رابطہ تھا، نہ ہی میرے اس مضمون کی مولانا کو کوئی خبر تھی، اس کے باوجود اچانک رابطہ کرنے کو بشارتِ غیبی اور فالِ نیک کے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ اس مضمون کو ہر پڑھنے والے کے لیے مفید اور لکھنے والے کے لیے دارِین کی کامیابی اور نبی کریم ﷺ کی شفاعت کا ذریعہ بنادے۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مرقد کے سامنے

مواجهہ شریف پر حاضری کے بعد تقریباً ایک ہاتھ کے بقدر داہنی طرف کو کھسک کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دبی ہوئی آواز میں سلام پیش کرنے کی کوشش کی، اس موقع پر یہ تصور قائم رہا کہ یہ وہ ہستی ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی نبوت کی تصدیق اس کے آغاز کے ساتھ ہی کی تھی، اور آپ ﷺ کی دعوت پر ابتداء ہی سے لبیک کہا تھا، اور جب مسلمانوں پر مکہ مکرمہ کی زمین اتنی تنگ کر دی گئی کہ اپنے دین پر قائم رہنا اُن کے لیے دشوار ہو گیا اور وہ اللہ و رسول ﷺ کے حکم سے ہجرت کرنے لگے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ امتیاز رہا کہ جب انہوں نے نبی کریم ﷺ سے ہجرت کرنے کی اجازت طلب کی، آپؐ نے فرمایا: ”لا تعجل لعلّ الله أن يجعل لك صاحبًا“ یعنی آپ اکیلے ہجرت کرنے کی جلدی نہ

کیجئے، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی رفیق سفر بھی عنایت فرمادیں۔

(البدایۃ والنہایۃ، ج: ۲، ص: ۵۶۰، ط: دار الفکر بیروت)

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ وہ عظیم الشان رفیق سفر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں گے، چنانچہ اس وقت رُک گئے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہجرت کرنے کی سعادت حاصل کر لی، اور تین دن تک ”غارِ ثور“ میں بھی ساتھ رہے، جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس طرح فرمایا ہے:

”إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا
ثَانِي اثْنَيْنِ إِذْهُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ
اللَّهَ مَعَنَا“ (التوبة: ۴۰)

”یعنی اگر تم ان کی مدد نہیں کرو گے (تو کوئی پروا نہیں کیونکہ) اللہ نے تو اس وقت ان کی مدد کی جب کافروں نے اس حال میں ان کو (مکہ سے) نکالا تھا جب وہ دو آدمیوں میں سے دوسرے تھے، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ کچھ غم نہ کرو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے غارِ ثور کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ہونے کا اعزاز حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک جاں نثار خادم ہونے کا شرف بھی حاصل کر لیا، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آرام و راحت کی خاطر کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا، غارِ ثور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت گزاری سے متعلق اصحابِ سیر نے جو لکھا ہے، اس کا خلاصہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ نے ”تفسیر عثمانی“ میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

”یہ غار پہاڑ کی بلندی پر ایک بھاری محو ف چٹان ہے، جس میں داخل ہونے کا

صرف ایک راستہ تھا وہ بھی ایسا تنگ کہ انسان کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر اس میں گھس نہیں سکتا، صرف لیٹ کر داخل ہونا ممکن تھا، اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اندر جا کر اُسے صاف کیا، سب سوراخ کپڑے سے بند کیے کہ کوئی کیڑا کاٹنا گزند نہ پہنچا سکے، ایک سوراخ باقی تھا، اُس میں اپنا پاؤں اڑا دیا، سب انتظام کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اندر تشریف لانے کو کہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم صدیق کے زانو پر سر مبارک رکھ کر استراحت فرما رہے تھے کہ سانپ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پاؤں دس لیا، مگر صدیقؓ پاؤں کو حرکت نہ دیتے تھے، مبادا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی استراحت میں خلل پڑے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھلی اور قصہ معلوم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعابِ مبارک صدیقؓ کے پاؤں کو لگا دیا، جس سے فوراً شفا ہو گئی۔

(تفسیر عثمانی، سورۃ التوبہ)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قربانیوں اور اخلاص کا احاطہ کرنا تو بہت مشکل ہے، البتہ مندرجہ ذیل ایک واقعہ جو امام ترمذی رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے، نمونہ کے طور پر درج کیا جا رہا ہے، جس سے ان کے اخلاص کا ایک حد تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (غزوہ تبوک کے موقع پر) ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کرنے کا حکم دے دیا اور اتفاق سے اُس وقت میرے پاس کچھ مال موجود تھا، میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ آج میں ابوبکرؓ سے (اس کارِ خیر میں) سبقت کروں گا اگر یہ ممکن ہو سکا، پس میں نے اپنے پورے مال میں سے آدھا مال لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا کہ اپنے گھر والوں کے لیے کتنا باقی رکھا؟ میں نے کہا جتنا لایا ہوں اتنا ہی ان کے لیے بھی چھوڑا ہے، اور (اتنے میں) ابوبکرؓ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سارا ہی لے کر حاضر ہوئے، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ اے ابوبکر!

اپنے گھروالوں کے لیے کتنا باقی رکھا؟ صدیقؑ نے کہا: ان کے لیے میں نے اللہ اور اس کے رسول کو باقی رکھا ہے، (یعنی اللہ و رسول کی رضامندی ان کے لیے کافی ہے) حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ میں ابوبکرؓ سے کبھی بھی کسی کارِ خیر میں سبقت نہیں کر سکتا۔“

(ترمذی شریف، ج: ۲، ص: ۲۰۸، ط: قدیمی کتب خانہ)

مذکورہ بالا روایت کا مفہوم علامہ اقبالؒ نے ”بانگِ درا“ میں ”صدیقؑ“ کا عنوان لگا کر اپنے مخصوص اور مؤثر انداز میں ایک قصیدے کے اندر بیان کیا ہے، روایتِ بالا کے اندر حضرت ابوبکرؓ کے آخری جملہ کے مفہوم کو علامہ نے اپنے قصیدے کے آخری شعر میں جس انداز پر ذکر کیا ہے وہ شعر ایسا ہے کہ احقر جب بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت صدیقؑ کی محبت، وفاداری، غارِ ثور میں رفاقت اور پھر آخری آرام گاہ میں بھی آپ ﷺ کے جوار میں جگہ پانے کی سعادت کا تصور کرتا ہے تو وہ شعر ضرور یاد آتا ہے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؑ کے لیے ہے خدا کا رسول بس

حضرت صدیق اکبرؓ کی اسلامی زندگی پر اگر غور کیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت کے آغاز ہی سے وہ شروع ہوتی ہے اور حضرت ابوبکرؓ کو تقریباً ۲۳ سال تک مسلسل آقائے نامدار ﷺ کے زیرِ سایہ رہنے کا موقع مل جاتا ہے، اس دوران صدیق اکبرؓ ہر ہر نیکی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے، اور جب نبی کریم ﷺ کا وصال ہو جاتا ہے تو آپ ﷺ کی امانت سنبھالنے کے لیے تقدیرِ خداوندی ان کو

مزید دو سال تین مہینے کی مہلت دے دیتی ہے، اور جیسے ہی صدیق رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی ۶۳ سال تک پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک کے مطابق ہو جاتی ہے تو وہ خلافت کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو نامزد کرتے ہوئے اپنی جان کو مولائے کریم کے سپرد کر دیتے ہیں، اور تقدیرِ خداوندی آخری آرام گاہ کے طور پر ان کو جواری نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں جگہ عطا کرتی ہے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی پر غور کرنے والوں کو وہ حدیثِ نبوی بھی خود بخود یاد آتی ہے جس میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو جنت میں داخل ہونے کے لیے اس کے آٹھوں دروازوں سے بلائے جانے کی بشارت سنائی گئی ہے۔

(بخاری شریف، ج: ۱، ص: ۵۱۷، ط: قدیمی کتب خانہ)

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مرقد کے سامنے

آستانہ صدیقی پر حاضری کے بعد پھر ایک ہاتھ کے بقدر داہنی طرف کھسک کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو پست آواز اور جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ سلام پیش کرنے کی کوشش کی، اس موقع پر یہ تصور قائم رہا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل خصوصی دُعا فرمائی تھی:

”اللَّهُمَّ اعِزَّ الْإِسْلَامَ بِأَحَبِّ هَذَيْنِ الرَّجُلَيْنِ إِلَيْكَ بِأَبِي جَهْلٍ أَوْ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ“

یعنی ”اے اللہ! اسلام کو قوت پہنچا ابو جہل اور عمر بن الخطاب میں سے جو شخص آپ کے نزدیک زیادہ محبوب ہو اس کے ذریعہ۔“

(ترمذی شریف، ج: ۲، ص: ۲۰۹، ط: قدیمی کتب خانہ)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی مذکورہ دُعا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں قبول کر کے یہ واضح فرمادیا کہ میرے نزدیک ان دونوں میں سے محبوب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں، اس خصوصی دُعا کے بعد صرف یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی دولت سے نوازا، بلکہ اسلام کو ان کے ذریعہ تقویت بھی پہنچائی۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”مازلنا أعزّة منذ أسلم عمر“ یعنی ”جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا ہم برابر طاقتور اور باعزت رہے۔“ (بخاری شریف، ج: ۱، ص: ۵۲۰، ط: قدیمی کتب خانہ)

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”بے شک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام دین کے لیے قوت بنا، اور ان کی ہجرت اسلام کے لیے کامیابی اور مدد کا ذریعہ بنی، اور ان کی خلافت رحمت ثابت ہوئی، اللہ کی قسم! ہم خانہ کعبہ کے پاس اعلانیہ طور پر نماز پڑھنے پر قادر نہیں تھے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا، اور جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو مشرکین کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ ہم اعلانیہ طور پر خانہ کعبہ کے پاس نماز پڑھنے لگے۔“ (کنز العمال، ج: ۶، ص: ۲۶۸)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بے شک اللہ نے عمر کی زبان پر اور ان کے دل میں حق کو جاری کر دیا ہے۔“ آگے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی ایسا اہم معاملہ سامنے آتا کہ لوگ اس میں اپنی آراء ظاہر کر دیتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اپنے رائے ظاہر کر دیتے تو قرآن اس رائے کے مطابق نازل ہوتا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے دے چکے ہوتے۔ (ترمذی شریف، ج: ۲، ص: ۲۰۹، ط: قدیمی کتب خانہ)

اور بخاری و مسلم کی ایک روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
 ”تین احکام میں اللہ کے منہ کے مطابق میری رائے نکلی: مقام ابراہیم، حجاب
 اور بدر کے قیدیوں سے متعلق۔“

(متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۵۵۸، ط: قدیمی کتب خانہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اہل باطل پر ہمیشہ ان کا رعب و
 دبدبہ قائم رہتا تھا، اور ان کے مقابلہ کے لیے اہل باطل تیار نہیں ہو سکتے تھے، اور
 اگر کبھی مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ بھی ہو جاتے تو شکست ہی ان کی تقدّر بن جاتی،
 عام اہل باطل کو تو چھوڑیے! شر و فساد کا سرغنہ اور تمام برائیوں کی بنیاد اور کفر و شرک
 کا سپہ سالار ابلیس لعین بھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خوف سے لرزہ بر اندام ہو کر راستہ
 بدل لیتا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے
 ہوئے فرمایا:

”والذی نفسی بیدہ مالقیك الشیطان قطُّ سالکاً فجاً
 إلا سلك فجاً غیر فجک“

”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! شیطان جب بھی کسی
 گلی میں چلتا ہوا آپ کا سامنا کرتا ہے تو (آپ کے رعب سے) اس گلی کو چھوڑ کر
 دوسری گلی سے چلنے کو اختیار کرتا ہے۔“ (بخاری شریف، ج: ۱، ص: ۴۶۵)

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عدل و انصاف کی وہ مثالیں قائم کی ہیں جو تا روزِ
 قیامت آنے والے تمام اربابِ اقتدار کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں،
 کاش! مسلمانوں کے حکمران بلکہ ہر وہ مسلمان جس کو ادنیٰ سا اقتدار بھی حاصل ہو،
 چاہے کسی محکمہ کا ہو یا کسی ادارے کا، ادارہ بھی چاہے دینی ہو یا دنیوی! یہ تمام

حضرات اگر فاروقِ اعظمؓ کے عدل و انصاف کے واقعات اس نیت سے پڑھ لیتے کہ ہمیں ان کے طریقوں کو اپنانا ہے اور نبی کریم ﷺ کے اس فرمان ”علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدين المهديين“ یعنی ”لازم پکڑو میرا طریقہ اور راہِ راست پر چلنے والے راہِ حق پانے والے میرے خلفاء کا طریقہ۔“ (ابو داؤد شریف، ج: ۲، ص: ۲۸۷) کے مطابق آپ ﷺ کی سنتوں کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی سنتوں کو بھی مضبوطی سے پکڑنا ہے تو وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے اکثر مسائل خود بخود حل ہو جاتے، اور مسلمانوں کا ماحول جس طرح آج کل نظر آ رہا ہے اس سے بالکل مختلف ہوتا۔

اس مختصر مضمون میں امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عدل و انصاف اور زہد و قناعت کے بے شمار واقعات میں سے نمونہ کے طور پر صرف تین واقعات قلمبند کیے جا رہے ہیں:

پہلا واقعہ

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام اسلمؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک رات حسب معمول حضرت عمر رضی اللہ عنہ گشت فرما رہے تھے، اچانک ایک عورت کو دیکھا کہ اس نے اپنے گھر میں پانی سے بھری ہوئی ہانڈی آگ پر چڑھائی ہوئی ہے اور آس پاس چھوٹے بچے ہیں جو رو رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قریب آ کر پوچھا: اے اللہ کی بندی! یہ بچے کیوں رو رہے ہیں؟ اس نے کہا: بھوک سے! فرمایا: اس ہانڈی میں کیا ہے؟ کہا: اس میں پانی ہے، البتہ ان بچوں کے ذہنوں میں یہ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اس میں آٹا اور گھی ہے، تاکہ یہ خوشی خوشی میں سو جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دیکھ کر رونے لگے، پھر دارالصدقہ جہاں صدقات کا

سامان تھا تشریف لے گئے اور ایک بوری میں آٹا، گھی، چربی، کھجور، کپڑے، اور کچھ سگے بھر دیئے، اور مجھ سے (اسلم سے) فرمانے لگے کہ: یہ بوری میری پشت پر رکھیے، میں نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! آپ مجھے اٹھانے دیجئے، میں اٹھاؤں گا، فرمایا: اے اسلم! کیسے ناسمجھ ہو! میں ہی اٹھاؤں گا، اس لیے کہ قیامت میں مجھ ہی سے سوال ہوگا۔

بہر صورت! حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ہی وہ بوری اٹھاتے ہوئے اس عورت کے گھر پہنچے اور خود ہی ہانڈی میں کچھ آٹا اور چربی اور کھجور ڈال کر ملاتے رہے اور آگ کو تازہ رکھنے کے لیے ہانڈی کے نیچے پھونکتے رہے، اور چونکہ آپ کی داڑھی کافی بڑی تھی، اس لیے دھواں داڑھی کے درمیان میں سے نکلتا رہا، یہاں تک کہ کھانا تیار کر دیا، پھر اپنے ہاتھوں سے اُن بچوں کو کھلایا، یہاں تک کہ شکم سیر ہو گئے، پھر (ان بچوں کو ہنسانے اور خوش کرنے کے لیے) درندہ کی نقل اُتارتے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھنے اور چلنے لگے (میں تو اس کیفیت کو دیکھ کر حیران ہوا) البتہ ان سے کچھ پوچھنا میرے بس میں نہ تھا، وہ برابر ان بچوں کے ساتھ اسی طرح رہے، یہاں تک کہ وہ بچے بھی کھیلنے اور ہنسنے لگے، پھر مجھ سے فرمایا کہ: اے اسلم! جانتے ہو میں نے درندے کی نقل ان بچوں کے سامنے کیوں اتاری؟ میں نے کہا: نہیں، فرمایا: میں نے ان کو روتے ہوئے دیکھا تھا اور ایسی ہی حالت میں ان کو چھوڑ کر جانا مجھے پسند نہیں تھا، یہاں تک کہ میں نے ان کو ہنستے ہوئے دیکھا تو میرا دل خوش ہوا۔“ (کنز العمال، ج: ۶، ص: ۲۸۹، مطبوعہ بیروت)

دوسرا واقعہ

”اسلم کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ گشت کرنے کے لیے مدینہ سے باہر تشریف لے گئے، میں بھی ساتھ تھا، ہمیں ایک خیمہ نظر آیا جس میں سے ایک خاتون کے رونے کی آواز آرہی تھی جو درِ ذہ میں مبتلا تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے جب صورتحال معلوم کی تو معلوم ہوا کہ اس غریب خاتون کے پاس (کھانے پینے اور ولادت کے وقت درکار ضروری سامان میں سے) کچھ بھی نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ روئے لگے اور تیز قدموں کے ساتھ اپنے گھر تشریف لے جا کر اپنی زوجہ محترمہ ام کلثوم بنت علی بن ابی طالب سے کہنے لگے کہ: کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ اللہ آپ کو اجر و ثواب عطا فرمادے؟ اور ان کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا، انہوں نے کہا: کیوں نہیں؟ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی پشت پر آٹا اور چربی اور ام کلثومؓ نے ولادت کے لیے درکار ضروری سامان اٹھایا اور دونوں خیمہ کے پاس پہنچے، ام کلثومؓ تو اس خاتون کے تعاون کے لیے اندر تشریف لے گئیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے شوہر کے ساتھ باہر تشریف فرما ہو کر ان کے ساتھ بات چیت میں مصروف ہو گئے، وہ شخص یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ امیر المؤمنین ہیں، تھوڑی دیر بعد بچہ پیدا ہوا، ام کلثومؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پکارا کہ اے امیر المؤمنین! اپنے ساتھی کو بچے کی مبارکباد دیجئے، امیر المؤمنین کا لفظ سن کر وہ شخص چونک اٹھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے معذرت کرنے لگا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کوئی بات نہیں، اس کے بعد ان کی ضروریات کا خرچہ بھی دے دیا۔“

(البدایہ والنہایہ، ج: ۵، ص: ۲۱۶)

تیسرا واقعہ

”حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس وقت جب کہ وہ امیر المؤمنین تھے، دیکھا کہ اپنے کندھوں کے درمیان اپنے کرتے پر تین پیوند اس طرح لگا رکھے تھے کہ بعض دوسرے بعض پر چڑھے ہوئے تھے۔“

(کنز العمال، ج: ۶، ص: ۲۷۹)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی زندگی اور واقعات پر غور کرنے کے بعد ان کی ایسی خصوصیت بھی سامنے آتی ہے جو ان کے بعد سے آج تک نہ تو کسی کو اُس پیمانے

پر نصیب ہوئی ہے جس پیمانے پر ان کو حاصل تھی اور نہ ہی آج کے بعد سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ کسی کو حاصل ہو سکے گی، اور وہ خصوصیت ہے: ”بے پناہ شجاعت کے ساتھ ساتھ بے انتہاء تواضع“ عام طور پر یہ نظر آتا ہے کہ اگر کسی کے اندر شجاعت کی صفت موجود ہو تو پھر تواضع کی صفت موجود نہیں ہوتی یا کافی کمزور ہوتی ہے اور اگر اس کے اندر تواضع کی صفت موجود ہوتی ہے تو پھر شجاعت نظر نہیں آتی، لیکن حضرت امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شجاعت کا تو وہ مقام ہے کہ متکبرین کا سرغنہ ابلیس لعین جس نے فرعون کو ”أَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْلَى“ کہنے کی تعلیم دی وہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شجاعت و دبدبہ سے مرعوب ہو کر راستہ بدل لیتا، اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے تو علی الاعلان خانہ کعبہ کے سامنے نماز پڑھنے کا ارادہ کیا اور اس امت کا فرعون (ابو جہل) اور دیگر سردارانِ قریش ان کو اس علانیہ عبادت سے نہ روک سکے، اور ابن عساکر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ:

”جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا ارادہ کیا تو اپنی تلوار و کمان کو لے کر بیت اللہ کے پاس آئے جہاں سردارانِ قریش بیٹھے ہوئے تھے، بیت اللہ کا پورا طواف کیا، پھر مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا فرمائی، پھر مشرکین کی جماعت میں سے جو لوگ وہاں پر موجود تھے ایک ایک کے پاس آئے اور کہا کہ تمہارے یہ چہرے ذلیل ہو جائیں، جس کا ارادہ ہو کہ اس کی ماں اسے ناپید کر دے اور اس کی اولاد یتیم ہو جائے اور اس کی بیوی رانڈ ہو جائے وہ (مجھ کو ہجرت سے روکنے کے لیے) اس وادی کے پیچھے مل لے (لیکن ہوا یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رعب کی وجہ سے) ایک بھی ان میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نہ جاسکا۔“

(حیاء الصحابہ، ج: ۳، ص: ۵۸۴)

شجاعت کے مذکورہ بالا مقام پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تواضع کی یہ حالت تھی کہ ایک وسیع دولت اسلامیہ کے امیر المؤمنین ہونے کے باوجود بیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے تھے، اور بے سہارا خاندانوں کی خبر گیری کے لیے اپنی پشت پر ضروری سامان اٹھا کر لے جانے سے دریغ نہیں فرماتے تھے، خلاصہ یہ ہے کہ شجاعت و تواضع کا اس حد تک امتزاج حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شجاعت و تواضع، عدل و انصاف، زہد و قناعت، انتظامی امور میں اعلیٰ صلاحیت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ان کے لیے ایک خصوصی دُعا (جس کا تذکرہ ہو چکا ہے) کی برکت سے ان کے دورِ خلافت میں اسلام کو خوب قوت و ترقی حاصل ہوئی اور زیادہ پھیلنے کا موقع ملا، چنانچہ آپ ہی کے زمانہ میں ایران، شام، عراق، قدس، مدائن، مصر وغیرہ سب فتح ہوئے، اور ملتِ اسلامیہ کا پوری دنیا پر ایک رعب قائم ہو گیا۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی آخری تمنا

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں، پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اور پھر اپنے دورِ خلافت میں دینِ متین کے لیے بے شمار قربانیاں پیش کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی آخری ایک ایسی تمنا عرض کر دی جس کے تین اجزاء تھے:

پہلا جزء: ”اللہ کی راہ میں شہادت۔“

دوسرا جزء: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مدینہ منورہ کے اندر موت۔“

تیسرا جزء: ”کسی کلمہ گو کے ہاتھ سے نہیں بلکہ غیر مسلم کے ہاتھ سے شہادت۔“ شروع کے دو اجزاء سے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مندرجہ ذیل دعا نقل کی ہے: ”اللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي شَهَادَةً فِي سَبِيلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِي فِي بَلَدِ رَسُولِكَ“ یعنی ”اے اللہ! مجھے اپنے راستہ میں شہادت عطا فرما، اور اپنے رسول کے شہر میں وفات نصیب فرما۔“

(بخاری شریف، ج: ۱، ص: ۲۵۳)

اور تیسرے جزء سے متعلق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاذ حضرت زید بن اسلم کے واسطے سے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی یہ دعا نقل کی ہے: ”اللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَتْلِي بِيَدِ رَجُلٍ يَصْلِي لَكَ سَجْدَةً وَاحِدَةً يَحَاجُّنِي بِهَا عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ یعنی ”اے اللہ! کسی ایسے شخص کے ہاتھ میرا قتل مقدر نہ فرما جس نے آپ کے آگے کوئی ایک سجدہ بھی کیا ہو، جس کے سہارے وہ قیامت کے دن آپ کے دربار میں میرے ساتھ جھگڑا کر سکتا ہو۔“

(موطا امام مالک، ص: ۴۷۶)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کی اس آخری تمنا میں جن تین چیزوں کی دعا مانگی تھی ان کا جمع ہونا ظاہری اسباب کے اعتبار سے غیر متوقع تھا، اس لیے کہ آپ کے دورِ خلافت کے آخری دنوں میں حق و باطل کے معرکے تو مدینہ منورہ سے ہزاروں میل دور برپا تھے، اور ان ہی دور افتادہ مقامات میں شہادت کی توقع کی جاسکتی تھی اور مدینہ منورہ چونکہ مسلمانوں کا دار الخلافہ تھا اور اس میں مکمل طور پر امن و امان کی فضا قائم تھی تو وہاں پر موت کی توقع تو کی جاسکتی تھی، لیکن کسی کافر کے ہاتھ سے امیر المؤمنین کی شہادت کا ماحول موجود نہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مخلص

بندے کی مخلصانہ دعا کو قبول فرماتے ہوئے اُن تینوں چیزوں کو جمع فرما دیا، اور وہ اس طرح کہ مدینہ منورہ میں فیروز نام کا ایک مجوسی غلام تھا جس کی کنیت ابو لؤلؤ تھی، اس نے بروز چہار شنبہ ۲۶ رذوالحجہ ۲۳ھ کو ایسے وقت میں امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر خنجر سے پے در پے کئی وار کر کے شدید زخمی کر دیا جب وہ فجر کی نماز پڑھا رہے تھے، ان ہی زخموں کی وجہ سے تین دن کے بعد مدینۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اندر ہی شہادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے اور یکم محرم ۲۴ھ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں دفن ہونے کی سعادت سے بھی نوازے گئے۔ مشہور و رائج قول کے مطابق ان کی مدتِ خلافت دس سال چھ مہینے چار دن رہی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و أرضاه

مسجد نبوی کی اذانیں

مدینہ منورہ کی اس پہلی حاضری کے موقع پر جب مسجد نبوی کے احاطہ سے پُراثر آواز میں اذان کی تکبیریں بلند ہوئیں تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دل پر پڑے ہوئے غفلت کے پردوں کو ہٹایا جا رہا ہے اور ایمانی کیفیت میں اضافے کا سامان مہیا کیا جا رہا ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ ذیل فرمان کے مطابق شیطان لعین کو بھاگنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ أَدْبَرَ الشَّيْطَانُ لَهُ ضُرَاطٌ حَتَّى لَا يَسْمَعَ التَّأْذِينَ فَإِذَا قُضِيَ النَّدَاءُ أَقْبَلَ حَتَّى إِذَا ثُوبَ بِالصَّلَاةِ أَدْبَرَ حَتَّى إِذَا قُضِيَ التَّوْبِيبُ أَقْبَلَ حَتَّى يَخْطُرَ بَيْنَ الْمَرْءِ وَنَفْسِهِ يَقُولُ أَذْكَرَ كَذَا أَذْكَرَ كَذَا لَمَّا لَمْ يَكُنْ يَذْكَرُ حَتَّى يَظُلَّ الرَّجُلُ لَا يَذْكُرُ كَمْ صَلَّى“

(بخاری شریف، ج: ۱، ص: ۸۵)

یعنی ”جب نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے تو شیطان آواز کے ساتھ گوز خارج کرتا ہوا پشت پھیر کر بھاگتا ہے، تاکہ اذان نہ سنے، پھر جب اذان پوری ہو جاتی ہے تو واپس آ جاتا ہے، یہاں تک کہ جب اقامت شروع ہوتی ہے پھر پیٹھ دے کر بھاگتا ہے، اور جب اقامت پوری ہو جاتی ہے پھر واپس آ جاتا ہے، یہاں تک کہ نمازی اور اس کے نفس کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، کہتا ہے کہ فلاں بات یاد کرو، فلاں بات یاد کرو جو باتیں نمازی کو یاد بھی نہیں تھیں، یہاں تک کہ نمازی اس بات سے غافل ہو جاتا ہے کہ اس نے کتنی رکعت نماز پڑھی ہے۔“

جب مسجد نبوی کے قابل صدا احترام مؤذن صاحب نے اذان دیتے ہوئے ”أشهد أن محمداً رسول الله“ کی آواز اپنے مخصوص انداز و لہجے کے ساتھ بلند کی تو اس کے اثر و کشش سے ذہن سوچنے لگا کہ جب پندرہویں صدی ہجری میں مسجد نبوی کی اذان اتنی با اثر ہے تو ”اذانِ بلالی“ کی کیا کیفیت رہی ہوگی؟ ایسے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے مؤذن و صحابی حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ (متوفی: ۲۰ھ) سے محبت رکھنے والے اور ان کی زندگی سے ایک حد تک واقفیت رکھنے والے شخص کے ذہن میں ان کا وہ تاریخی واقعہ گھومنے لگتا ہے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں پیش آیا تھا جس زمانہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے سرزمینِ شام کے اندر ”دارِ یا“ قصبہ میں سکونت اختیار کر رکھی تھی۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

امام نور الدین علی بن احمد السہودی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۹۲۲ھ) نے اپنی کتاب ”خلاصة الوفاء بأخبار دار المصطفى“ میں ابن عساکر کے حوالہ سے سندِ جید کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اس زمانہ کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے جب وہ دمشق کے مضافات میں واقع ”دارِ یا“ قصبہ میں مقیم تھے، اس قصہ کا خلاصہ اردو

زبان میں پیش کیا جا رہا ہے:

”حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، آپ فرما رہے ہیں: اے بلال! یہ کیا یادتی ہے؟ اے بلال! کیا آپ کے لیے میری زیارت کرنے کا وقت نہیں آیا؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حزن و ملال کی حالت میں بیدار ہوتے ہی اپنی سواری پر سوار ہو کر مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے، مدینہ منورہ پہنچ کر روضہ اقدس پر رونے دھونے کے ساتھ حاضری دی، اس دوران حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما ان کے پاس تشریف لائے جنہیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے سینے سے لگا کر پیار کیا، ان دونوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہماری تمنا ہے کہ آپ مسجد نبوی میں کم از کم ایک مرتبہ تو ایسی اذان دیں جس طرح آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں دیا کرتے تھے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ آل نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس خواہش کو پورا کیے بغیر نہ رہ سکے اور اذان دینے کے لیے آمادہ ہو گئے اور جیسے ہی مدینہ کی فضاء میں بلالی آواز کے ساتھ ”اللہ اکبر اللہ اکبر“ کی صدا بلند ہوئی تو شہر میں کھرام مچ گیا، اور جب ”أشهد أن لا إله إلا الله“ کی آواز بلند ہوئی تو کھرام میں اضافہ ہو گیا اور جب ”أشهد أن محمداً رسول الله“ کا جملہ بلالی لہجہ کے ساتھ مدینہ منورہ کی فضاء میں گونجنے لگا تو پردہ نشین خواتین تک بھی باہر نکل آئیں اور کہنے لگیں کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ دنیا میں تشریف لائے؟ رونے والوں اور رونے والیوں کی اتنی بڑی تعداد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سانحہ وفات والے دن کے علاوہ مدینہ میں کسی نے نہیں دیکھی ہوگی۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر خود بھی اتنا اثر ہوا کہ اذان مکمل نہ کر سکے۔“ (خلاصۃ الوفاء باخبار دارالمصطفیٰ، ص: ۹۸، مطبوعہ دمشق)

مسجد نبوی کی نمازیں اور امام حرم سے پہلی ملاقات

امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح البخاری میں اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”صلوة في مسجدي

هَذَا خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ صَلَوةٍ فِيهَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ“ یعنی: ”میری اس مسجد میں ایک نماز مسجد حرام کے علاوہ دیگر مسجدوں کی ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔“ (بخاری شریف، ج: ۱، ص: ۱۵۹)

ہمیں حرمین شریفین کی اس پہلی زیارت کے لیے جامعۃ الملک سعود کی طرف سے مختصر وقت کے لیے اجازت ملی تھی، اس لیے مسجد نبوی میں ظاہری گنتی کے اعتبار سے تو چند ہی نمازیں ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، لیکن مندرجہ بالا صحیح حدیث کی روشنی میں اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ ان کی معنوی تعداد بڑھ گئی ہوگی، اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

احقر نے حجاز مقدس کی حاضری سے پہلے امام مسجد نبوی شیخ علی عبد الرحمن الحذیفی زید مجدہم کی بااثر و پرکیف تلاوت ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ دارالعلوم دیوبند میں سنی تھی، جس سے غائبانہ طور پر ان سے ایک قلبی اور گہری محبت پیدا ہو گئی تھی، مسجد نبوی کی اس پہلی حاضری کے موقع پر دل میں یہ تمنا تھی کہ شیخ حذیفی کی تلاوت براہ راست سننے اور ان کی زیارت کرنے کا موقع ملے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمنا اس طرح پوری کر دی کہ شب جمعہ کو عشاء کی نماز کے وقت محافظین کے درمیان ایک نورانی چہرہ والے میانہ قد شخص جن کے چہرے پر معصومیت و سادگی کے آثار نمایاں تھے تشریف لائے اور نماز پڑھانے کے لیے مسجد نبوی کی محراب کی طرف آگے بڑھے، میں محراب کے سامنے غالباً چوتھی صف میں تھا، نماز شروع ہوئی اور ثناء کے بعد جیسے ہی امام صاحب نے سورہ فاتحہ کی پہلی آیت پڑھی، احقر کو یقین ہو گیا کہ یہی تو امام الحرم شیخ علی عبد الرحمن الحذیفی ہیں، شیخ نے نماز کی دونوں جہری رکعتوں میں سورہ احزاب کا آخری حصہ پڑھا۔

غور کیا جائے! سالوں سال کی تمناؤں کے بعد مسجدِ نبوی کی پہلی زیارت حاصل ہو رہی ہو اور اسی فضاء میں فرض نماز باجماعت ادا کی جا رہی ہو جس میں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان شریک ہوں، اُن مسلمانوں میں عرب و عجم، مسافر و مقیم، بوڑھے و جوان، مرد و خواتین اور امیر و فقیر سب کی شمولیت ہو، تھوڑی دیر پہلے اسی فضاء سے ایک ایسی اذان کی آواز بلند ہو چکی ہو جس نے دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو، نماز میں شیخِ حذیفی کی تلاوت ہو رہی ہو اور وہ بھی سورۃِ احزاب کے اس حصہ کی جس میں نافرمان لوگوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد موجود ہو: ”يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَلَيْتَنَّا اطَّعْنَا اللَّهَ وَاَطَّعْنَا الرَّسُولَ“ یعنی: ”جس دن ان کے چہرے (جہنم کی) آگ میں الٹ پلٹ کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے کہ: اے کاش! ہم اللہ کی فرمانبرداری کرتے اور اس کے رسول کا حکم مانتے۔“ (الاحزاب: ۶۶) اور ذرا آگے فرماں برداروں سے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہو: ”وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا“ یعنی ”اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا تو یقیناً وہ بڑی کامیابی پائے گا۔“ (الاحزاب: ۷۱)

زندگی میں پہلی بار حاضری دینے والا شخص جب مسجدِ نبوی کے احاطہ اور روضہٴ اقدس کے جوار میں فرض نماز کے اندر مذکورہ بالا جیسی آیتوں کی تلاوت شیخِ حذیفی کی زبان سے سماعت کرے گا تو اس کا دل جتنا بھی غفلتوں میں ڈوبا ہوا ہوگا پھر بھی خوف ورجاء کی ملی جلی کیفیت سے لرزے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کا بدن جتنا بھی گناہ آلود ہوگا وہ بھی کانپے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کی آنکھیں بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

سلام پھیرنے کے بعد شیخِ حذیفی نے حسبِ معمول مڑ کر اپنا رخ مقتدیوں کی

طرف کر دیا اور اذکارِ مسنونہ میں مشغول ہو گئے، مجھے چونکہ محراب کے بالکل سامنے چند ہی صفیں چھوڑ کر جگہ ملی تھی، اس لیے ان کے بابرکت اور نورانی چہرہ کی زیارت کا ایک اچھا موقع تھا، لہذا اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر ذرا فاصلہ سے ان کی زیارت کی، اور اگلے دن بروز جمعہ فجر کی نماز کے بعد جب وہ مسجدِ نبوی سے واپس قیام گاہ کی طرف تشریف لے جا رہے تھے راستہ میں ان سے مختصر ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔

روضہ جنت میں حاضری

مدینہ منورہ کے اس والہانہ سفر کے دوران روضہ جنت میں حاضری کا موقع بھی ربِّ کریم نے عنایت فرمایا، مسجدِ نبوی میں منبر سے بائیں طرف تقریباً پچاس ہاتھ کے فاصلے پر ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا حجرہ مبارکہ ہے، جہاں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے ہیں، منبر اور حجرے کے درمیان والے حصہ سے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ”ما بین بیتی ومنبری روضۃ من ریاض الجنة“، یعنی: ”جو جگہ میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان ہے وہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔“ (بخاری شریف، ج: ۱، ص: ۱۵۹)

اس حدیث کی تشریح میں علماء کرام کا مشہور قول یہ ہے کہ یہ لفظ اپنی حقیقت پر محمول ہے اور مسجدِ نبوی کا مذکورہ بالا حصہ بعینہ قیامت کے دن جنت میں منتقل کیا جائے گا، اور حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند (متوفی: ۱۳۹۲ھ) کے حوالہ سے ان کے خصوصی شاگرد اور ہمارے محترم اُستاد حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری دامت برکاتہم العالیہ (۱) استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند نے ”ایضاح البخاری، ج: ۶، ص: ۸۱“

میں ایک عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے کہ روضہ جنت میں داخل ہو کر عبادت کرنے والے کو نیک فالی کے طور پر یہ اُمید رکھنی چاہیے کہ ان شاء اللہ! وہ جنت سے محروم نہیں ہوگا، اس لیے کہ جنت میں جانے کے بعد کسی کو پھر اس سے نکال کر محروم نہیں کر دیا جاتا۔

نبی کریم ﷺ کی زندگی کے آخری دن کا ایک منظر

روضہ جنت میں حاضری کا موقع ہو یا غائبانہ طور پر اس کا اور حجرہ مبارکہ و محراب و منبر کا تذکرہ ہو، احقر کو بخاری شریف کی وہ روایتیں ضرور یاد آتی ہیں جن میں نبی کریم ﷺ کے مرض الموت اور زندگی کے آخری دن کا ایک منظر بیان کیا گیا ہے، ان روایات کا مفہوم و خلاصہ یہ ہے:

”نبی کریم ﷺ اپنے مرض الموت کے دوران بھی جب ذرا سی طاقت رہتی مسجد میں تشریف لا کر نماز پڑھا دیتے، جب ضعف کافی بڑھ گیا تو وفات والے دن سے پہلے مسلسل تین دن (جمعہ، ہفتہ، اتوار) تک آپ ﷺ مسجد میں تشریف نہ لاسکے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے حکم سے نمازیں پڑھاتے رہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ ﷺ کی بیماری میں اضافے اور مسجد میں عدم تشریف آوری کی وجہ سے کافی غمگین تھے، چوتھے دن بروز پیر ایک ایسے وقت میں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فجر کی نماز میں صف باندھے کھڑے تھے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے، آپ ﷺ نے اچانک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کا پردہ ہٹایا اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا منظر دیکھ کر خوشی اور اطمینان کی وجہ سے مسکرانے اور پھر ہنسنے لگے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کا چہرہ مبارک اتنا منور و پاکیزہ اور پر رونق معلوم ہو رہا تھا جیسے قرآن کریم کا ورق ہو، اور چونکہ کئی نمازوں کے

بعد ہمیں آپ ﷺ کے چہرہ انور کی زیارت نصیب ہو رہی تھی، اس لیے قریب تھا کہ فرطِ مسرت سے ہمارے اندر ایک ایسی اضطرابی کیفیت پیدا ہو جائے جو نماز میں نقصان کا باعث بنے، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ سمجھ کر کہ شاید آپ تشریف لا رہے ہیں اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگے، لیکن آپ ﷺ نے اشارہ سے بتادیا کہ تم اپنی نماز پوری کر لو اور آپ ﷺ نے پردہ جو ہٹایا تھا واپس ڈال دیا، اس کے بعد ہمیں آپ ﷺ کی زیارت میسر نہ ہو سکی اور اُسی دن حضور ﷺ کی وفات ہو گئی۔“

(بخاری شریف، ج: ۱، ص: ۹۳-۹۴ نیز ج: ۲، ص: ۶۴۰)

راقم نے بخاری شریف جلد اول حضرت الاستاذ مولانا نصیر احمد خان صاحب قدس سرہ (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) (متوفی: ۱۴۳۱ھ) اور جلد ثانی حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم (موجودہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) سے تعلیمی سال ۱۴۰۱ھ-۱۴۰۲ھ کو دارالعلوم دیوبند میں پڑھی تھی، نبی کریم ﷺ کے مرض الموت اور زندگی کے آخری دن کے مذکورہ بالا منظر سے متعلق حدیثیں چونکہ بخاری شریف جلد اول میں ”بابُ اَہْلِ الْعِلْمِ وَالْفَضْلِ أَحَقُّ بِالْإِمَامَةِ“ کے تحت بھی آگئی ہیں اور جلد ثانی میں ”بابُ مَرَضِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوَفَاتِهِ“ کے تحت بھی! اس لیے دونوں اکابرین نے اپنے اپنے انداز کے مطابق ان پر گفتگو فرمائی تھی۔

حضرت الاستاذ مولانا نصیر احمد خاں صاحب قدس اللہ سرہ پر تو ایسے مضمون کو بیان کرتے ہوئے اس طرح رقت طاری ہو جاتی تھی کہ زیادہ تفصیل سے بات کرنا ان کے لیے دشوار ہو جاتا، لیکن ان کی رقتِ قلبی اور اخلاص کی برکت سے طلبہ کو پھر بھی بہت کچھ مل جاتا، اور حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

دامت برکاتہم نے اپنے خدادادِ ملکہِ افہام و تفہیم اور حبِ نبوی کی بدولت اس مضمون کو ایک ایسے انداز میں بیان فرمایا تھا کہ طلبہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ شاید ہم بھی پیر کے دن کی صبح کا یہ مبارک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور پھر اُسی دن کے آخر میں نبی کریم ﷺ فداہِ اُبی و اُمّی کے وصال کا مشکل ترین مرحلہ بھی ہمارے سامنے وقوع پذیر ہوتا ہے: ”اللّٰہم صل علی محمدٍ النبی الّٰامی و علی آلہ و سلّم تسلیما۔“

ستونہائے رحمت کی زیارت

روضہ جنت میں سات ستون ہیں جن کو اسطواناتِ رحمت کہا جاتا ہے، ان کے نام حسبِ ذیل ہیں:

- ۱:..... اسطوانہ حنّانہ، ۲:..... اسطوانہ اُبولبابہؑ، ۳:..... اسطوانہ حرس،
- ۴:..... اسطوانہ وفود، ۵:..... اسطوانہ سریر، ۶:..... اسطوانہ جبریلؑ،
- ۷:..... اسطوانہ عائشہؓ۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان ستونہائے رحمت کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا اور ہر ایک ستون نے اپنی تاریخِ یاد دلائی، اول الذکر دو ستونوں سے متعلق کچھ تفصیل درج کی جا رہی ہے:

اسطوانہ حنّانہ

اُسطوانہ حنّانہ اس جگہ پر بنایا ہوا ستون ہے جہاں کھجور کا ایک تنا تھا، جو نبی کریم ﷺ کے فراق پر زور زور سے رویا تھا، اس تنے سے متعلق صحیح البخاری ”کتاب الجمعة، ج: ۱، ص: ۱۲۵“ اور ”کتاب المناقب، ج: ۱، ص: ۵۰۶“ اور

سنن ترمذی ”ابواب الجمعة، ج: ۱، ص: ۱۱۳“ میں روایات موجود ہیں، اسی طرح امام عبد اللہ بن عبد الرحمن الدارمی رحمہ اللہ (متوفی: ۲۵۵ھ) نے سنن دارمی میں مقدمہ کے اندر ایک مستقل باب بعنوان ”باب ما أكرم الله النبي صلى الله عليه وسلم بحنين المنبر“ قائم کر کے گیارہ روایتیں ذکر کی ہیں، مذکورہ تمام روایات کا خلاصہ و مفہوم یہ ہے:

”مسجد نبوی میں منبر بننے سے پہلے جب نبی کریم ﷺ خطبہ دیتے تھے تو کھجور کے ایک تنے کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے تھے، اور جب آپ ﷺ کے لیے منبر کا انتظام کر دیا گیا اور آپ ﷺ اس منبر پر خطبہ دینے کے لیے تشریف لے گئے تو وہ تنہا فراقِ نبی (ﷺ) کا صدمہ برداشت نہ کر سکا، اور اس سے دس ماہ کی گاہن اونٹنی کے رونے کی طرح آواز آنے لگی اور اتنا رویا گویا پھٹ جائے گا، اس کے رونے کی آواز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی سنتے رہے، یہاں تک کہ حضور ﷺ منبر سے نیچے اترے اور اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر سینے سے لگایا جس سے وہ اس بچے کی طرح جسے تھکیاں دے کر خاموش کیا جاتا ہے ہچکیاں لیتے ہوئے خاموش ہو گیا، نبی ﷺ نے فرمایا کہ: اگر میں نے اس تنے کو اپنے سینے سے نہ لگایا ہوتا تو یہ اسی طرح قیامت تک روتا رہتا، پھر آپ ﷺ نے دفنانے کا حکم دے دیا، چنانچہ اُسے دفن دیا گیا۔“

راقم عرض کرتا ہے کہ اسطوانہ حثانہ کی زیارت کرنے والوں کو مذکورہ واقعہ کا استحضار کرتے ہوئے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ جب ایک غیر مکلف خشک تنہا جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی اُس مخلوق سے ہو جس نے امانتِ خداوندی (شریعت کاملہ کی پابندی) کے بوجھ اٹھانے سے ابتداء ہی سے معذرت کر لی ہو وہ بھی نبی کریم ﷺ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ غمِ فراق میں بلک بلک کر رو رہا ہے تو اُس انسان کو جس نے

امانتِ خداوندی کے بوجھ اٹھانے کے لیے شروع ہی سے آمادگی ظاہر کی ہو اور پھر ”لا
إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ“ پڑھنے کا اظہار بھی کیا ہو اُسے اپنے نبی ﷺ
سے کتنی محبت کرنی چاہیے؟

اس سوال کا واضح جواب یہ ہے کہ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی
ذمہ داری کا احساس کرے اور اللہ کے فرمان ”أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا
الرَّسُولَ“ پر عمل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے ہر حکم کی
اطاعت و پیروی کرے اور نبی ﷺ کی سنتوں کو زندہ کرنے کی کوشش کرے۔

اسطوانہ حٹانہ کی زیارت کے وقت اس کے مذکورہ بالا واقعہ اور اپنی ذمہ
داری کا احساس کرتے ہوئے اگر زائر اپنی استقامت کے لیے لجاجت کے ساتھ
دعا کرے گا اُمید ہے کہ رب کریم اس کی دعا کو قبولیت سے نوازے گا۔

اسطوانہ ابولبابہؓ

اسطوانہ ابولبابہؓ وہ ستون ہے جس کے ساتھ حضرت ابولبابہؓ نے اظہارِ
توبہ و ندامت کے طور پر اپنے آپ کو باندھ لیا تھا، کیونکہ وہ غزوہ تبوک میں شریک
نہیں ہو سکے تھے، اور بالآخر اُن کی توبہ قبول ہو گئی تھی، اس ستون کی زیارت نے
سورہ توبہؓ کی آیت نمبر: ۱۰۲ یا دد لائی جس کے بارے میں علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے
اپنی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ: ”یہ آیت نبی ﷺ
کی غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد حضرت ابولبابہؓ اور ان کے ساتھیوں کے حق
میں نازل ہوئی، جن کی کل تعداد چھ یا آٹھ یادس تھی“، ان حضرات میں سے حضرت
ابولبابہؓ کے نام پر تمام روایات متفق ہیں، باقی حضرات کی تعداد اور ناموں میں
مختلف روایات ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے غزوہ تبوک میں شرکت کے لیے اعلانِ عام فرمایا تھا، اور سب مسلمانوں کو چلنے کا حکم دیا تھا، البتہ کچھ ایسے مخلص مسلمان تھے جن کے پاس معقول عذر تھا، ان کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا، کچھ منافقین تھے جنہوں نے جھوٹے اعذار پیش کر دیئے، اور شریک نہیں ہوئے، ان منافقین کے بارہ میں سورہ توبہ میں سخت وعیدیں نازل ہوئیں، مسلمانوں میں کچھ ایسے حضرات بھی تھے جو صرف وقتی سستی کی بنیاد پر نبی ﷺ کے اس اعلانِ عام پر تو عمل نہ کر سکے اور غزوہ تبوک سے پیچھے رہ گئے، مگر بعد میں اخلاص کے ساتھ نادم و تائب ہو گئے اور منافقین کی طرح جھوٹے اعذار تلاش نہیں کیے، اور بالآخر ان سب کی توبہ قبول ہو گئی، بلا عذر پیچھے رہنے والے ان حضرات کی بھی دو جماعتیں ہو گئی تھیں، ایک جماعت وہ تھی جنہوں نے نبی ﷺ کی واپسی کے بعد فوراً اپنی ندامت و توبہ کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا، اور یہ عہد کیا کہ جب تک ہماری توبہ قبول نہ ہوگی اور ہمیں خود رسول اللہ ﷺ نہیں کھولیں گے ہم اسی طرح بندھے ہوئے قیدی رہیں گے، رسول اللہ ﷺ کو جب ان کے اس عہد کا پتہ چلا تو فرمایا کہ: اللہ کی قسم! میں بھی ان کو اس وقت تک نہیں کھولوں گا جب تک اللہ تعالیٰ مجھے ان کے کھولنے کا حکم نہیں دے گا، اس پر سورہ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

”وَآخِرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ“

(التوبة: ۱۰۲)

”اور کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا انہوں نے ملے جلے عمل کیے کچھ اچھے اور کچھ برے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے، بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

اس جماعت میں حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، جب مذکورہ آیت اتری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی توبہ قبول ہونے کی خوشخبری سنائی اور صحابہؓ کو ان کے کھولنے کا حکم دے دیا، تو حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو کر مجھے اپنے دستِ مبارک سے نہیں کھولیں گے میں بندھا رہوں گا، چنانچہ فجر کی نماز میں آپ تشریف لائے تو اپنے دستِ مبارک سے ان کو کھولا، حضرت ابولبابہؓ والی اس جماعت نے توبہ کرنے کا ایسا مخلصانہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمادی جس میں تاروزِ قیامت آنے والے ان تمام مسلمانوں کے لیے جن کے اعمال نیک و بد ملے جلے ہوں اور وہ اپنے گناہوں سے اخلاص کے ساتھ تائب ہو جائیں معافی اور مغفرت کی امید ہے۔

غزوہ تبوک میں صرف سستی کی وجہ سے شرکت نہ کرنے والے مخلص مسلمانوں کی دوسری جماعت مندرجہ ذیل تین انصاری صحابہؓ پر مشتمل تھی:

۱:..... حضرت کعب بن مالکؓ ۲:..... حضرت مرارہ بن ربیعؓ

۳:..... حضرت ہلال بن امیہؓ

یہ حضرات اگرچہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ والی جماعت کی طرح طریقہ تو اختیار نہ کر سکے، تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر صاف صاف اپنی سستی اور کوتاہی کا اعتراف کر لیا اور کوئی جھوٹا عذر پیش نہیں کیا، ہاں! یہ وضاحت ضرور کر دی کہ یہ کوتاہی صرف سستی کی بنا پر ہوئی ہے، نفاق کی وجہ سے نہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی سچائی کو تسلیم فرماتے ہوئے ان کی کوتاہی کی بنیاد پر صحابہ کرامؓ کو یہ حکم دیا کہ جب تک اللہ تعالیٰ ان کے حق میں کوئی فیصلہ نہیں فرمائیں

گے تب تک ان سے سلام اور کلام کا مقاطعہ کیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعراض اور صحابہ کرامؓ کے مقاطعہ سلام و کلام کی انتہائی مصیبت پچاس دن تک جھیلنے کے بعد ان تینوں حضرات کی توبہ کو بھی رب کریم نے قبول فرما کر ان کے حق میں سورہ توبہ کی مندرجہ ذیل آیت نازل فرمادی:

”وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ
الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَن
لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ
هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ“
(التوبة: ۱۱۸)

”اور ان تین شخصوں پر بھی (اللہ نے مہربانی کی) جن کا معاملہ ملتوی رکھا گیا تھا، یہاں تک کہ جب زمین باوجود اس قدر وسیع ہونے کے ان پر تنگ ہو گئی، اور وہ خود بھی اپنی جانوں سے تنگ آ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ کی گرفت سے انہیں کہیں پناہ نہیں مل سکتی، مگر یہ کہ اسی کی طرف رجوع کیا جائے، پھر اللہ نے ان پر مہربانی کی تاکہ وہ توبہ کریں، بلاشبہ اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔“

آیت اترنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے ان تینوں کو توبہ قبول ہونے کی خوشخبری سنا کر مبارکباد دی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ کے ساتھ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو مبارکباد دی: ”بشارت ہو تمہیں ایک ایسے مبارک دن کی جو تمہاری زندگی میں پیدائش سے لے کر آج تک سب سے زیادہ بہتر دن ہے۔“ اس واقعہ کی پوری تفصیل (صحیح البخاری، ج: ۲، ص: ۶۳۴-۶۳۶) اور حدیث کی دیگر کتابوں میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے درج ہے۔

بہر کیف! ہر وضہ جنت میں اسطوانہ ابولبابہ کی زیارت حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ

اور ان کے ساتھیوں کا مذکورہ واقعہ یاد دلاتی ہے، اور پھر اُن کی مخلصانہ توبہ کی قبولیت کے نتیجہ میں اُتری ہوئی سورہ توبہ کی آیت نمبر: ۱۰۲ پر جب غور کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس کے الفاظ کے عموم سے اندازہ ہوتا ہے کہ ارحم الراحمین نے صرف حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ والی جماعت کے حق میں نہیں بلکہ بعد میں آنے والے تائبین (چاہے وہ پندرہویں صدی ہجری کے پرفتن زمانہ کے تائبین کیوں نہ ہوں) کے حق میں بھی قبولیتِ توبہ کا وعدہ فرمایا ہے، اور پھر اسی مناسبت سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ والی جماعت کا مذکورہ واقعہ اور ان کے حق میں اُتری ہوئی سورہ توبہ کی آیت نمبر: ۱۱۸ خود بخود یاد آتی ہے، اور ایک ایسی کیفیت زائر کے اندر پیدا ہو جاتی ہے جس کا مفہوم شیخ فرید الدین عطارؒ نے مندرجہ ذیل دو شعروں میں بیان کیا ہے:

بر درآمد بندہ بگریختہ آبروئے خود بعصیاں ریختہ
مغفرت دارد امید از لطفِ تو زانکہ خود فرمودہ لا تقنطوا

قارئین کرام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ حقیر راقم الحروف، اس کے والدین و اقارب، اس کے اساتذہ کرام اور اس کے محبین و محسنین کو بھی دعائے خیر میں شامل فرمائیں، و جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔

حجازِ مقدس سے واپسی

اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ہمیں ”جامعۃ الملک سعود، ریاض“ کی طرف سے مختصر وقت کے لیے حجازِ مقدس جانے کی اجازت ملی تھی، اس لیے حرمین شریفین کی ہماری یہ پہلی حاضری مختصر ہی رہی، اتنے مختصر وقت میں واپسی

اور حرمین شریفین کی بابرکت فضاؤں سے جدائی کے لیے دل آمادہ نہ تھا، تاہم قانونی مجبوری کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا اور بروز جمعہ ۲۰ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ بعد العصر مدینہ منورہ سے پریم آنکھوں کے ساتھ ریاض روانہ ہوئے:

حیف! در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم بہار آخر شد

”جامعة الملك سعود“ کے شب و روز

احقر نے ”جامعة الملك سعود، ریاض“ میں اپنے اساتذہ کرام کے مشورہ و اجازت سے چار بنیادی مقاصد کے پیش نظر داخلہ لینے کی سعی کی تھی:

پہلا مقصد: یہ تھا کہ اس صورت میں حرمین شریفین کی حاضری اور حج کی سعادت میسر ہو جائے گی، جس کے لیے عرصہ سے دل تڑپ رہا تھا، اور وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔

دوسرا مقصد: یہ تھا کہ عربی زبان جو کہ قرآن کریم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے اور ہر طالب علم بلکہ ہر مسلمان کی ایک دینی ضرورت ہے، اس میں نکھار اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ طالب علم کو ماحول میں رہنے اور اس زبان کو اس کے اصلی سرچشموں سے تلاش کرنے کا موقع ملے، احقر کو یہ امید تھی کہ ”معهد اللغة العربية جامعة الملك سعود“ میں داخلہ ملنے کی صورت میں اس مقصد کے حصول کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔

تیسرا مقصد: یہ تھا کہ دیارِ عرب کے علماء و مشائخ جو نجی اور بالکل سادہ

طریقے سے مساجد میں علوم دینیہ پڑھاتے ہیں اور اصلاحی بیانات کرتے ہیں ان سے خارجی اوقات میں کچھ نہ کچھ استفادہ کرنے کا موقع ملے گا۔

چوتھا مقصد: یہ تھا کہ بالخصوص حضرت شیخ عبدالفتاح ابو غدہ حلبی شامی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہنے اور ان کے علوم و معارف سے استفادہ کرنے کا شاید کوئی موقع نصیب ہوگا۔ شیخ ابو غدہؒ ایک متبحر، متقی اور حنفی المسلك عالم دین تھے، اور دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابرین سے والہانہ تعلق رکھتے تھے، دارالعلوم دیوبند میں ان کے علوم و تصانیف کا چرچہ تھا، اور وہ میرے زمانہ قیام سے پہلے دارالعلوم تشریف بھی لاچکے تھے، موصوف ”جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية، ریاض“ کے استاذ تھے جو کہ ”جامعة الملك سعود، ریاض“ کے بعد دوسرا بڑا جامعہ تھا، البتہ اُس جامعہ میں داخلہ کی صورت نہیں تھی، تا کہ شیخ ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست استفادہ کا موقع مل جاتا، تاہم احقر کو یہ امید ضرور تھی کہ خارجی اوقات میں کسی نہ کسی طرح ان سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مذکورہ چاروں مقاصد کے حصول کے راستے ہموار ہو گئے، چنانچہ ”جامعة الملك سعود“ میں دو سالہ قیام کے دوران پہلا مقصد اس طرح پورا ہو گیا کہ اس مدت کے اندر حرمین شریفین کی بار بار حاضری اور حج کی سعادت میسر ہوئی، پہلی حاضری ماہ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ کو میسر ہوئی، جس کی تفصیل درج کی جا چکی ہے، اسی سال اپنی زندگی کا پہلا حج بھی میسر ہوا، اگلے سال ۱۴۰۹ھ کو بھی حج کی سعادت حاصل کر سکتا تھا، اس لیے کہ میں حج کے ایام میں

”جامعۃ الملک سعود“ میں موجود تھا اور جامعہ میں چھٹیاں بھی چل رہی تھیں، لیکن اس وقت سعودی عرب کا قانون یہ تھا کہ جس شخص نے ایک مرتبہ حج کیا ہو وہ اگلے پانچ سال تک حج نہ کریں، تاکہ حج کے ایام میں زیادہ رُش کی صورت پیدا نہ ہو اور زندگی میں پہلی بار حج کرنے والے حضرات سہولت کے ساتھ فریضہ حج ادا کر سکیں، اس قانون کی زد سے بچنے کے لیے لوگوں نے مختلف راستے ڈھونڈ لیے تھے، لیکن احقر کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ”جامعۃ الملک سعود“ میں داخلہ ملنے کے ذریعہ تو اللہ تعالیٰ نے حرمین شریفین کی زیارت اور فریضہ حج ادا کرنے کی سعادت سے مجھے نوازا ہے، اب سعودی عرب اور ”جامعۃ الملک سعود“ کے قانون سے بچنے کے لیے راستے ڈھونڈنا بے وفائی ہوگی اور ایسے حج کو ”حجِ مبرور“ کہنا بھی مشکل ہوگا، لہذا حرمین شریفین کی زیارت کے لیے بے تابی کے باوجود حج کے ایام میں جامعہ میں رہا اور دوسرا حج نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ صلہ عطا فرمایا کہ ۱۴۰۸ھ کے بعد سے تادم تحریر جو تقریباً اٹھائیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اس دوران وقفہ وقفہ سے مزید چار دفعہ (۱۴۱۴ھ-۱۴۲۷ھ-۱۴۲۹ھ-۱۴۳۳ھ) کو حج پر جانے کا موقع نصیب ہوا جس سے مجموعی تعداد پانچ ہوگئی اور متعدد بار عمرہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی: ”رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔“

احقر جب اپنی حقیقت اور کوتاہیوں پر غور کرتا ہے تو اپنے آپ کو ان سعادتوں کا اہل ہرگز نہیں پاتا، اور جب اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ”وَزَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ“ (اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے) پر غور کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو یہ

سمجھ میں آتا ہے کہ ارحم الراحمین تو مجھ جیسے نااہلوں کو بھی محروم نہیں فرماتا، لہذا یہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اپنے بزرگوں اور بالخصوص حضرت حافظ عبدالستار صاحبؒ کی خصوصی دعا (جس کا تذکرہ ہو چکا ہے) کا اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ روزِ محشر میں بھی اسی طرح رحمت و فضل اور عفو و درگزر کا معاملہ فرمائے۔

”جامعة الملك سعود“ کے ماحول میں عربی زبان سیکھنے کا ایک اچھا موقع

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ ”معهد اللغة العربية جامعة الملك سعود“ میں داخلہ لینے کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ ماحول میں رہ کر عربانِ زبان سیکھنے، بولنے اور لکھنے کا ایک اچھا موقع ملے گا، اسی جذبہ کے تحت میں نے طے کیا تھا کہ ”جامعة الملك سعود“ میں اگر ممکن ہو تو متشرع، بااخلاق اور باصلاحیت عرب طلبہ کے ساتھ رہائش رکھوں گا، تاکہ ان سے بیک وقت عربی زبان اور اسلامی آداب و اخلاق میں استفادہ کیا جاسکے، اور یہ بھی طے کیا تھا کہ ”جامعة الملك سعود“ کے قیام کے دوران صرف فصیح عربی زبان میں گفتگو کرنے کی کوشش کروں گا اور اپنے ہم وطنوں اور ہم زبانوں سے بھی بوقتِ ملاقات و گفتگو کسی اور زبان کے بجائے عربی زبان کو ترجیح دوں گا۔ رہائش سے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ کرم کیا کہ سعودی عرب کے ”شقراء“ نامی شہر کے رہنے والے چند نیک و صالح، پابندِ شریعت اور باصلاحیت طلبہ کے ساتھ رہائش ملی، جن سے روزمرہ کی گفتگو فصیح عربی زبان میں ہوا کرتی تھی، اور کبھی علمی و ادبی موضوعات سے متعلق بھی

تبادلہ خیال ہو جاتا، وہ حضرات آپس میں تو ”اللغة العامية“ (بگڑی ہوئی
زباں) بولتے تھے، لیکن میری رعایت میں مجھ سے ”اللغة الفصحیة“ (فصحی
زباں) میں بات کرتے تھے، جس سے مجھے کافی فائدہ ہوا، اپنے ہم وطنوں اور ہم
زبانوں سے جب مسجد، مطعم، درسگاہ وغیرہ آتے جاتے ملاقات ہو جاتی اور میں عربی
میں بات کرتا تو وہ کچھ ناراض ہو جاتے کہ تم اپنی زبان میں گفتگو کیوں نہیں کرتے؟
میں عربی زباں کی محبت میں ان کی ناراضگی کو بادلِ نخواستہ برداشت کر لیتا، اس تھوڑی
سی محنت و قربانی کا فائدہ یہ ہوا کہ ”وحدة اللغة والثقافة“ کا دو سالہ کورس احقر
نے بتوفیق اللہ ایک ہی سال میں پورا کر کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کر لی، اور
اگلے سال شعبہ ”اعداد المعلمین“ میں داخلہ ہوا اور اس کا ایک سالہ کورس بھی پورا
کیا، اس کے علاوہ پورے جامعہ کی سطح پر منعقد کیے جانے والے تین مسابقاتِ علمیہ
میں بھی حصہ لیا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے دو مسابقات میں پہلی اور ایک مسابقہ میں
دوسری پوزیشن حاصل کی، جن کی بنیاد پر چار سونے کے تمغے (گولڈ میڈل) نقد
انعامات اور اپنے کورس کی سند کے علاوہ ”طالب مثالی“ کی ایک خصوصی سند بھی ملی،
اور جب دو سال ”جامعة الملك سعود“ میں گزار کر دارالعلوم دیوبند واپسی ہوئی
تو دارالعلوم میں بھی احقر کی ہمت افزائی کی گئی، چنانچہ دارالعلوم سے نکلنے والے عربی
جریدے ”الداعی“ (۱۲/۶/۱۴۱۰ھ) اور ”ماہنامہ دارالعلوم“ (ماہِ رجب ۱۴۱۰ھ)
اور پندرہ روزہ ”آئینہ دارالعلوم“ (یکم تا پندرہ ماہِ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ) تینوں نے
حضرت الاستاذ مولانا معراج الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند
(متوفی: ۱۴۱۲ھ) کے ایما پر احقر کی نمایاں کامیابی کی رپورٹ شائع کر دی۔ قارئین

کی دلچسپی کے لیے ”آئینہ دارالعلوم دیوبند“ کے ایڈیٹر جناب مولانا کفیل احمد علوی صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند کی رپورٹ کا متن پیش کیا جا رہا ہے:

آئینہ دارالعلوم کی رپورٹ

مولانا عبدالرؤف صاحب افغانی مدرس دارالعلوم دیوبند کی

”جامعۃ الملک سعود“ سے دارالعلوم واپسی

”جامعۃ الملک سعود (ریاض) خلیجی ممالک کا سب سے بڑا علمی مرکز ہے، جس میں سعودی عرب اور دیگر مختلف ممالک کے تقریباً ۳۶ ہزار طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں، جامعہ میں مختلف ۱۴ کلیات اور ایک ”معهد اللغة العربية“ ہے، دارالعلوم دیوبند کی سفارش پر مولانا کا داخلہ ۱۴۰۸ھ میں شعبہ ”وحدة اللغة والثقافة“ میں ہوا، جس کا دو سال کا کورس ہے، موصوف نے اپنی محنت اور خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے یہ کورس جو کافی اہم ہے، ایک ہی سال میں پورا کر لیا، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس میں امتیازی سند بھی حاصل کر لی، ۱۴۰۹ھ میں یعنی دوسرے سال شعبہ ”اعداد المعلمین“ میں داخلہ ہوا، اس کا ایک سالہ کورس ہے، اس شعبہ میں عام طور پر انہی طلبہ کو داخلہ کا مجاز قرار دیا جاتا ہے، جو سعودی جامعات سے فارغ ہوتے ہیں، اور جن کے نمایاں نمبرات ہوتے ہیں، مولانا عبدالرؤف صاحب کو ”وحدة اللغة العربية“ میں اول پوزیشن حاصل کرنے کی وجہ سے داخلہ کا مستحق قرار دیا گیا، ”معهد اللغة العربية“ جس کے تحت تین شعبے ہیں: ۱:..... وحدة اللغة والثقافة، ۲:..... تدريب المعلمين، ۳:..... اعداد المعلمين، اس میں تقریباً چالیس ملکوں کے طلبہ پڑھتے ہیں، اس پورے ”معهد اللغة العربية“ سے ہر سال

ایک ہی طالب علم کا ”طالب مثالی“ کے عنوان سے انتخاب کیا جاتا ہے، جس کو خصوصی انعام کے علاوہ ایک خصوصی سند ”طالب مثالی“ کے نام سے دی جاتی ہے، انتہائی مسرت کی بات ہے کہ گزشتہ سال ۱۴۰۹ھ میں ”طالب مثالی“ کا عظیم اعزاز مولانا عبدالرؤف صاحب نے حاصل کیا۔ اس کے علاوہ موصوف نے تین مسابقات میں جو کہ پورے جامعہ کی سطح پر منعقد ہوئے شرکت کی:

۱:..... قرآن کریم (حفظ تجوید و تفسیر)، ۲:..... القراءة الحرة، ۳:..... خطابت (عربی زبان میں تقریر)۔ اول الذکر: ۱، ۲ میں مولانا نے فرسٹ پوزیشن اور ۳ میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کی۔

مذکورہ تینوں مسابقات میں اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے اور ”طالب مثالی“ منتخب ہونے کی وجہ سے تین ہزار سات سو پچاس نقد ریال، متعدد اہم کتابیں، ایک خوبصورت قیمتی بریف کیس، بہترین کاغذ پر طبع شدہ دو قرآن پاک، عربی تقاریر کے کیسٹ اور سونے کے چار میڈل انعام میں دیے گئے۔

پورے جامعہ میں مولانا کی ذہنی و فکری اور علمی صلاحیتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور یہ تمام تفصیل سعودیہ کے ہفت روزہ اخبار ”رسالة الجامعة“ میں نمایاں سرخی کے ساتھ شائع کی گئی۔

مولانا عبدالرؤف صاحب دارالعلوم دیوبند کے ایک لائق استاذ ہیں، طلبہ میں مقبول ہیں، اور ذمہ دارانِ دارالعلوم کی نگاہ میں بھی ان کا مقام بلند ہے، درس و تدریس میں انہماک کے ساتھ اہتمام کی جانب سے انہیں دوسری ذمہ داریاں بھی سونپی جاتی رہتی ہیں، ہم موصوف کو ان کی عظیم الشان کامیابیوں پر تہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

(ادارہ)

عرب علماء سے استفادہ کا موقع

”جامعة الملك سعود“ کے زمانہ قیام میں اللہ تعالیٰ نے تیسرے مقصد

کے حصول کے لیے اس طرح آسانی پیدا فرمادی کہ خارجی اوقات کے اندر اُن عرب علماء سے استفادہ کرنے کا موقع میسر ہوا جو مساجد میں سادہ طریقے سے پڑھاتے تھے اور اصلاحی بیانات بھی کرتے تھے، جامعہ میں ہفتہ وار دو چھٹیاں (جمعرات اور جمعہ) تو مستقل طور پر ہوا کرتی تھیں، امتحانات سے آگے پیچھے یا کسی اور مناسبت سے چھٹیاں ان کے علاوہ تھیں، ان چھٹیوں میں میری کوشش ہوتی تھی کہ اُن عرب علماء کی خدمت میں حاضری دیا کروں جو مختلف مساجد میں درس دیا کرتے تھے یا ان کے بیانات ہوتے تھے، تاکہ ان کے علوم و اخلاق، عادات و خصائل، طرزِ تدریس و طریقہ بیان اور عربی لب و لہجہ سے استفادہ کیا جاسکے، میرے پاس نہ تو ذاتی کوئی سواری تھی اور نہ راستوں سے واقفیت اور نہ ہی اُن مشہور علمائے کرام کے نظام الاوقات کا صحیح علم! اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ان مقامی عرب طلبہ اور ساتھیوں کو جو مشہور علمائے کرام کے نظام الاوقات سے متعلق میری راہنمائی فرماتے رہے، اور مناسب وقت پر اپنی ذاتی سواریوں کے ذریعہ بلا تکلف مجھے ان کی مساجد اور دروس و بیانات کے مقامات تک پہنچاتے رہے اور وہ خود بھی ان کے دروس میں شریک ہوتے رہے۔

سعودی عرب کے جن علمائے کرام کے دروس و بیانات میں شرکت اور ان سے استفادہ کا موقع ملا، ان میں ساحتہ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ باز رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۲۰ھ)، فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۲۱ھ)، فضیلۃ الشیخ عبداللہ بن عبدالرحمن بن جبرین رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۳۰ھ) سرفہرست ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان علمائے کرام کا کچھ تذکرہ خیر ہو جائے:

سماعۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کا ذکرِ خیر

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ میں سعودی عرب کے مایہ ناز عالم دین اور مفتی اعظم تھے، ۱۲/۱۲/۱۳۳۰ھ کو سعودی عرب کے شہر ریاض میں آپ کی پیدائش ہوئی، تین سال کی عمر میں والد ماجد کا انتقال ہوا، اور والدہ ماجدہ نے آپ کی تربیت کی ذمہ داری سنبھالی، بچپن میں حفظِ قرآن مکمل کیا اور پھر مزید دینی علوم حاصل کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گئے، بیس سال کی عمر میں ان کی بینائی مکمل طور پر چلی گئی، لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری، اور بڑے بڑے اہل علم حضرات سے مروجہ علوم کی تکمیل کی، ان کے مشہور اساتذہ میں سے شیخ محمد بن ابراہیم آل الشیخ، شیخ محمد بن عبداللطیف آل الشیخ، شیخ سعد بن حمد عتیق، شیخ صالح عبدالعزیز آل الشیخ اور شیخ سعید وقاص بخاری رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔

علوم مروجہ سے فارغ ہونے کے بعد اپنی خداداد صلاحیت و تقویٰ کی بنیاد پر مختلف علمی و انتظامی مناصب پر فائز رہے، چنانچہ ۱۳۵۷ھ تا ۱۳۷۱ھ منطقہ خرج میں منصب قضاء کی نازک ذمہ داری انجام دیتے رہے، اور پھر ”کلیۃ الشریعۃ“ ریاض میں مدرس رہے، اس کے بعد ۱۳۸۱ھ تا ۱۳۹۰ھ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے نائب رئیس اور ۱۳۹۰ھ تا ۱۳۹۵ھ اس کے رئیس رہے، اور بالآخر ”إدارة البحوث العلمیة والإفتاء“ کے رئیس، ملک کے مفتی اعظم اور ”انجمن کبار العلماء“ کے رئیس نامزد کیے گئے، اور ان عہدوں پر تا وفات فائز رہے۔

شیخ ابن بازؒ سے پہلی بار ٹیلیفون پر رابطہ

۱۴۰۸ھ کو جب احقر کا داخلہ ”جامعة الملك سعود ریاض“ میں ہوا تو ابتدائی دنوں میں ایک روز مطالعہ کے دوران ”حدیثِ قرطاس“ سے متعلق جو امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح البخاری ”کتاب العلم“ (ج: ۱، ص: ۲۲) کے اندر ذکر کی ہے، کچھ اشکال پیش آیا، جس کے حل کے لیے جامعہ کی لائبریری کا رخ کیا جہاں صحیح البخاری کی دو اہم شروح (فتح الباری، ج: ۱، ص: ۲۵۱-۲۵۳) اور (عمدة القاری جلد اول جزء ثانی، ص: ۱۶۹-۱۷۲) کا مطالعہ کیا، لیکن اشکال پھر بھی مکمل طور پر حل نہ ہو سکا، اس وقت دل میں آیا کہ کیوں نہ سماتہ الشیخ عبدالعزیز بن بازؒ سے بذریعہ فون اس سلسلہ میں استفادہ کیا جائے، کیونکہ ساتھیوں نے بتایا تھا کہ شیخ ابن باز ایک مقررہ وقت پر فون پر بھی سوالات کے جوابات دیتے ہیں، احقر نے مقررہ وقت پر جامعہ کے اندر طلبہ کے لیے لگے ہوئے مفت فون سروس کے ذریعہ ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، شیخ کا فون مسلسل مصروف جا رہا تھا، لیکن آخر کار رابطہ ہو گیا، احقر نے سلام مسنون کے بعد اپنا مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں عبدالرؤف نامی ”معهد اللغة العربية جامعة الملك سعود ریاض“ کا ایک جدید غیر ملکی طالب علم ہوں، اور بخاری شریف کی ”حدیثِ قرطاس“ میں مجھے یہ اشکال (تفصیل کا یہ موقع نہیں) درپیش ہے، امید ہے کہ آپ اس کا حل بتا دیں گے۔ شیخ نے اپنے الفاظ میں تقریباً وہی پوری بات ذکر فرمادی جو حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے، جس سے ان کے زبردست حافظہ کا اندازہ ہوا، احقر نے مذکورہ حدیث سے متعلق مزید کچھ اشکالات

پیش کیے، جن کے بارہ میں شیخ نے فرمایا کہ: یہ تفصیل طلب اشکالات ہیں، بہتر یہ ہوگا کہ آپ جمعرات کو میرے گھر پر بعد الظہر تشریف لا کر اس موضوع پر گفتگو کریں، اور میرے ساتھ دو پہر کا کھانا بھی کھائیں، میں نے کہا: یہ تو میری سعادت ہوگی! ضرور حاضر ہوں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ!

ہماری یہ گفتگو عربی زبان میں ہو رہی تھی جس کی بنیاد پر شیخ نے دورانِ گفتگو احقر کی ہمت افزائی فرماتے ہوئے عربی لہجہ میں گفتگو کی تحسین فرمائی، اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ گفتگو آپس میں غیر متعارف دو آدمیوں کے درمیان نہیں بلکہ ایک مشفق والد اور ان کے بیٹے کے درمیان ہو رہی ہے، ان کے طرزِ گفتگو سے یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود بات کو جلد از جلد ختم کرنا نہیں چاہتے، جب کہ میں تو دل دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ ایک عظیم اور مصروف ترین عالمِ دین کا زیادہ وقت لے رہا ہوں، بات چیت کے دوران میں نے شیخ سے اپنی ”لِلّٰہِ فِی اللّٰہِ“ محبت کا اظہار بھی کر دیا جس کے جواب میں انہوں نے اللہ کی محبت نصیب ہونے کی دعا سے مجھے نوازا، اور آخر میں میں نے ان سے دعائے خیر میں فراموش نہ کرنے کی درخواست کی، انہوں نے درخواست کو قبول فرماتے ہوئے مجھ سے بھی یہی فرمائش کی اور بات ختم ہو گئی۔

شیخ ابن باز سے احقر کی پہلی ملاقات

جمعرات کو حسب وعدہ ساحتہ الشیخ عبدالعزیز بن باز کی قیام گاہ پر بعد نمازِ ظہر حاضر ہوا جہاں ان کے مہمان خانے میں زائرین و مہمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود تھی، احقر بھی مہمان خانے کے ایک کونے میں شیخ کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد شیخ اپنی قیام گاہ کے اندر والے حصہ سے مہمان خانہ تشریف لائے اور محبت بھرے لہجہ میں مہمانوں کو سلام کرنے کے ساتھ ساتھ خوش آمدید کہا اور سب سے بالترتیب مصافحہ کیا، جب میری باری آئی اور میں نے ان کو سلام کر کے مصافحہ کیا اور آگے اپنا نام بتانے اور فون پر کی گئی گفتگو کا حوالہ دینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ شیخ نے آواز سے پہچان کر خود ہی میرا نام لیا اور فون پر ”حدیثِ قرطاس“ سے متعلق گفتگو کا حوالہ بھی دے دیا، میری حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ ایک ایسے شخص جن سے روزانہ بے شمار لوگ ملتے ہیں، اور لاتعداد لوگ فون پر بھی ان سے رابطہ میں رہتے ہیں اور اسی سال کے قریب ان کی عمر ہے، وہ صرف ایک ہی مرتبہ ایک ادنیٰ اور اجنبی طالب علم کی آواز و نام فون پر سن لیتے ہیں اور پھر درمیان میں ایک یاد و دن گزر بھی جاتے ہیں، اس کے بعد لوگوں کے ازدحام کے باوجود جب دوبارہ اس کی آواز سن لیتے ہیں تو فوراً پہچان لیتے ہیں اور نام بھی بتا دیتے ہیں!! اب اسے یا تو قوتِ حافظہ کہا جائے، یا فراستِ ایمانی کا نام دیا جائے، یا پھر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے بصارتِ توان سے لے لی تھی، لیکن اس کے عوض ان کو بے نظیر بصیرت اور رسوخ فی العلم کی دولت سے مالا مال فرمایا تھا۔

سلام و مصافحہ کے بعد میں نے شیخ کے سامنے ”حدیثِ قرطاس“ کا ذکر کیا، شیخ نے حسب وعدہ اس پر سیر حاصل بحث کی، جس سے مجھے کافی حد تک تشفی ہوئی، البتہ مکمل تشفی کچھ عرصہ بعد اس وقت ہوئی جب امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہ (متوفی: ۱۰۳۴ھ) کے مکتوبات (بزبانِ فارسی) میں سے ایک مفصل اور تحقیقی مکتوب پڑھنے کا موقع ملا۔ اگر کسی کو اس موضوع پر تحقیق درکار

ہو تو ”فتح الباری“ اور ”عمدة القاری“ کے مذکورہ بالا مقامات کے ساتھ ساتھ مکتوباتِ امام ربانی دفتر دوم، حصہ ہفتم، مکتوب نمبر: ۹۶، صفحہ نمبر: ۱۰۲ تا ۱۱۰ (مطبوعہ: امرتسر و کراچی) کا مطالعہ فرمائیں۔

تھوڑی دیر بعد عربی پلاؤ کے بڑے بڑے گول تھال زمینی دسترخوان پر رکھے گئے اور ہر تھال میں سنت کے مطابق چند افراد شریک ہوئے، شیخ بھی زمین پر بیٹھ کر مہمانوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے، ان کے لیے کوئی مخصوص جگہ یا کوئی مخصوص کھانا نہیں تھا، اور نہ ہی لباس یا نشست و برخاست و گفتگو میں کسی قسم کا تکلف شامل تھا، ان کی سادگی کو دیکھ کر کوئی نیا آنے والا زائر یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اپنے زمانہ میں سعودی عرب کے سب سے مشہور عالم دین ساحتہ الشیخ عبدالعزیز بن باز جن کو سرکاری طور پر بھی وزیر کا مقام و عہدہ حاصل ہے اور جن کو سعودی عرب کے بادشاہ بھی والد کا مقام دے کر ”والدنا و شیخنا“ سے یاد کرتے ہیں، وہ یہی سادہ شخص ہوں گے، اس نشست میں احقر نے دیکھا کہ شیخ مہمانوں کی مزاج پرسی بھی فرما رہے ہیں اور بلا امتیاز ہر ایک کی بات کو غور سے سن بھی رہے ہیں اور ہر ایک کے سوال کا جواب بھی عنایت فرماتے ہیں۔

شیخ کی مصروفیت اور ان کے علمی و عرفی مقام کے باوجود اتنی خاکساری و فروتنی کہ ہر خاص و عام کی بات کو غور سے سننا اور کسی کو بھی اپنے عالی مقام کا احساس نہ دلانا اس بات کی واضح دلیل تھی کہ وہ آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں اور طریقوں کو ہمیشہ سامنے رکھتے تھے اور ان کے مطابق عمل بھی کرتے تھے، اور بخاری و ترمذی کی مندرجہ ذیل دو حدیثوں اور ان جیسی دوسری حدیثوں کو ہمیشہ پیش

نظر رکھتے تھے:

۱:.... ”عن أنس بن مالك قال كانت الأمة من إماء أهل المدينة لتأخذ بيد رسول الله صلى الله عليه وسلم فتنتلق به حيث شاءت“

(رواہ البخاری، ج: ۲، ص: ۸۹۷)

ترجمہ: ”حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مدینہ والوں کی باندیوں میں سے ایک باندی (بھی یہ کر سکتی تھی کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر جہاں لے جانا چاہتی لے جاتی۔“

۲:.... ”عن أنس بن مالك أن امرأة جاءت إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقالت: إن لي إليك حاجة فقال: اجلسي في أيّ طريق المدينة شئت أجلس إليك“

(رواہ الترمذی فی الشمائل، ص: ۲۲)

ترجمہ: ”حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو مدینہ کے راستوں میں سے جس راستے میں چاہے بیٹھ جاؤ میں تیرے پاس (تیری بات سننے کے لیے) بیٹھ جاؤں گا۔“

یہ شیخ کی پہلی زیارت و ملاقات تھی، اس کے بعد بھی موقع بہ موقع ان کے دروس و بیانات میں شرکت کی سعادت ملتی رہی، ان کے بیان سے محسوس ہوتا تھا کہ ان کے دل میں امت کی اصلاح کے لیے ایک مضبوط تڑپ اور مستحکم ولولہ موجود ہے، اور وہ جو بات کرتے ہیں وہ صرف زبان سے ادا نہیں ہو رہی بلکہ دل کی گہرائیوں سے نکل کر سامعین کے دلوں سے ٹکراتی ہے۔ اسی مضبوط ایمانی جذبہ کا

اثر تھا کہ شیخ اپنے بڑھاپے اور پیرانہ سالی کے باوجود دینی کاموں سے تھکتے نہیں تھے، اور نہ ہی پوچھنے والوں کے بے تحاشا اور بعض غیر ضروری سوالات سے غصیلان یا تنگ مزاجی کا شکار ہو جاتے، شیخ کی زندگی کی ایک چشم دید جھلک ذیل میں پیش کی جا رہی ہے جس سے ان کے ولولے اور تحمل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

شیخ ابن بازؒ کی بے پناہ مصروفیت و تحمل کا ایک واقعہ

ایک دن شیخ کی خدمت میں احقر ایسے وقت میں حاضر ہوا کہ وہ اپنے دفتر سے نکل کر ذرا فاصلہ پر واقع مسجد میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے لیے پیدل روانہ ہو رہے تھے، اس دوران لوگوں کی ایک اچھی خاصی جماعت بھی ان کے ساتھ موجود تھی، اور جس کو بھی موقع ملتا شیخ سے کوئی سوال کر لیتا، اسی حالت میں مسجد پہنچ کر شیخ نے ظہر کی نماز باجماعت ادا کی، فرض نماز کے بعد دو رکعت سنتِ راتِ بے پڑھنے لگے اور جیسے ہی تشہد کے لیے بیٹھ گئے تو ان کی دائیں بائیں جانب لوگ جمع ہونے لگے اور سلام پھیرتے ہی ان سے مسائل پوچھنے لگے اور یہ سلسلہ دفتر واپسی تک جاری رہا، جب دفتر میں داخل ہوئے تو وہاں پر ایک سے زائد ٹیلی فون لائینوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں، اور ٹیلی فون لائن پر موجود ہر شخص شیخ سے بات کرنا چاہتا تھا، ٹیلی فون آپریٹر باری باری شیخ سے ان کی بات کرانے لگے، شیخ ہر شخص کی بات نہایت تحمل سے سن کر جواب دیتے رہے، ٹیلی فون لائینوں پر موجود حضرات کی آواز تو میں نہیں سن سکتا تھا، البتہ شیخ کے جوابات سے یہ اندازہ کر لیتا کہ مسائل نے کیا سوال کیا ہوگا! مجھے اس دوران یہ اندازہ ہوا کہ بعض لوگ تو بہت گہرے اور علمی سوالات کر رہے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو ایک ہی سوال بار بار پوچھ رہے ہیں

اور غیر ضروری سوالات بھی کر رہے ہیں، لیکن شیخ تحمل کے ساتھ ان سب کی باتیں سن رہے ہیں، اور جوابات دے رہے ہیں۔ اسی دوران یہ بھی مشاہدہ ہوا کہ شیخ کے دفتر کے دو مثنیٰ حضرات میں سے ہر ایک مختلف کاغذات اور فائلوں پر مشتمل ایک موٹا پلندا ہاتھ میں لیے ہوئے اس انتظار میں شیخ کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے کہ جیسے ہی شیخ کو کچھ فرصت ملے تو ان کاغذات و فائلوں سے متعلق اُن کی رائے معلوم کر کے انہیں نمٹا دیا جائے۔

بہر کیف! شیخ ابن بازؒ ٹیلی فون لائنوں پر اطمینان کے ساتھ سوالات کے جوابات بھی دیتے رہے اور درمیان میں جب کوئی تھوڑا سا وقفہ ہوتا اس میں دفتری کام نمٹاتے رہے، اور اتنے زیادہ کام کے باوجود نہ تو ان کے چہرے پر کوئی بل نظر آتا اور نہ ہی اندازِ کلام سے کسی رنجیدگی یا در ماندگی کا پتہ چلتا، بلکہ یوں محسوس ہوتا کہ ان کی خواہش و آرزو یہی ہے کہ اس مستعار زندگی کا ہر لمحہ اس ذات کی مرضی میں خرچ ہو جس نے یہ زندگی عطا کی ہے، اور اپنے علم و صلاحیت، شہرت و مقبولیت اور حکومت و عوام دونوں کی سطح پر حاصل و جاہت کو کسی طرح بھی دنیوی، ذاتی اور فانی مفادات کے لیے استعمال نہ کیا جائے، بلکہ ان کو دینی اور ابدی مقاصد پر لگا دیا جائے، خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص ساحتہ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن بازؒ کی زندگی کو قریب سے دیکھ کر اس کا جائزہ لیتا وہ قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کی ایک تصویر اور عملی تفسیر پالیتا:

”قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ
الْعَالَمِينَ“
(الأنعام: ۱۶۲)

یعنی ”کہہ دو بے شک میری نماز اور میری تمام عبادات اور میرا جینا اور میرا مرنا

اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہاں کا پروردگار ہے۔“

شیخ کی وفات اور مسجدِ حرام میں نمازِ جنازہ

شیخ نے اس دنیائے فانی کے اندر اپنی مستعار زندگی کے نو اسی سال اور ڈیڑھ مہینہ گزار کر بروز جمعرات ۲۷ / محرم ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۳ / مئی ۱۹۹۹ء ”طائف“ کے علاقہ میں واقع محلہ ”عودہ“ کے اندر اپنے مکان میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور اپنے ساتھ نیکوں کا ایک بڑا ذخیرہ لے کر واصلِ بحق ہو گئے۔ اگلے دن بروز جمعہ نمازِ جمعہ کے بعد حرمِ مکی میں ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی، جس میں خادم الحرمین الشریفین، ان کے ولی العہد اور دیگر اعلیٰ عہدیداروں سمیت ملک و بیرون ملک کے بے شمار علماء، صلحاء اور عام مسلمانوں نے شرکت کی، جن کی تعداد روزنامہ ”عکاظ“ (عربی) شمارہ: ۲۹، محرم ۱۴۲۰ھ کی رپورٹ کے مطابق دو ملین افراد سے زیادہ تھی۔ نمازِ جنازہ کے بعد مکہ مکرمہ کے قبرستان ”مقبرۃ العدل“ میں ان کو سپرد خاک کیا گیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری اور ان کا تذکرہ خیر

فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ سعودی عرب کے ان چیدہ علماء میں سے تھے جن پر وہاں کی سرزمین ناز کرتی ہے، وہ علم و تقویٰ، زہد و قناعت اور ہمدردی و اخلاص کے پیکر تھے۔ شیخ ابن عثیمین اپنے ملک میں ”انجمن کبار العلماء“ کے رکن رکن اور کلیۃ الشریعۃ جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ (شاخ قصیم) کے استاذ اور ”عُنَیْزَہ“ شہر کی مشہور جامع مسجد ”الجامع الکبیر“ کے امام و خطیب تھے۔

ان کے علم و تقویٰ سے متعلق میں نے بہت کچھ سنا تھا اور غائبانہ طور پر ان سے کافی متاثر ہو گیا تھا اور دل چاہ رہا تھا کہ ان کی خدمت میں حاضری اور ان کے علوم و فیوض سے استفادہ کرنے کا کوئی موقع ملے۔ اللہ کی توفیق سے یہ تمنا اس طرح پوری ہوئی کہ ”جامعۃ الملک سعود ریاض“ میں پڑھنے کے زمانہ میں چھٹیوں کے دوران چند مرتبہ ”عُنَیْزَہ“ جا کر ”الجامع الکبیر“ کے اندران کے حلقہ درس میں شرکت اور ان سے ملاقات کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے حالات سے واقفیت کا موقع بھی ملا، اسی طرح رمضان المبارک میں مسجد

حرام کے اندر دوسری منزل پر اُن کا درس ہوا کرتا تھا، اس میں بھی حسبِ موقع چند مرتبہ شرکت نصیب ہوئی۔

شیخ کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اور عوام دونوں کی سطح پر مقبولیتِ عامہ عطا کی تھی۔ سعودی عرب جیسے مالدار ترین ملک میں اپنی مقبولیت سے شیخ نے کوئی ذاتی مفاد حاصل نہیں کیا، بلکہ اپنے اختیار سے اپنے لیے فقر کی زندگی کو ترجیح دی، ان کی زندگی کو سامنے رکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شیخ نے مندرجہ ذیل تین حدیثوں اور ان سے ملتی جلتی دیگر حدیثوں کو صرف پڑھا اور پڑھا یا نہیں تھا، بلکہ ان کو حرزِ جان بنا کر اپنی عملی زندگی کا حصہ بنالیا تھا، اور ان حدیثوں میں واقع مسنون دعائیں صرف پڑھتے نہیں تھے بلکہ ان کے مفہوم کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے اپنی طاقت کے بقدر مکمل جدوجہد اور سعی پیہم فرماتے تھے، تین حدیثیں بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

۱:- ”عن أبي سعيد رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: اللهم أحيني مسكيناً وتوفني مسكيناً واحشني في زمرة المساكين“

(رواه الحاكم وصححه ووافقه الذهبي)

ترجمہ: ”حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا: اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں دنیا سے اٹھانا اور مسکینوں کے گروہ میں میرا حشر فرما۔“

۲:- ”عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: اللهم اجعل رزق آل محمد قوتاً وفي رواية كفافاً“ (متفق عليه)

ترجمہ: ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ

سے یہ دعا کی کہ: اے اللہ! محمد کے گھر والوں کی روزی بس بقدر کفاف ہی رکھیے۔“
 ۳:- ”عن أبي أُمَامَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: عَرَضَ عَلَيَّ رَبِّي لِيَجْعَلَ لِي بِطَحَاءِ مَكَّةَ ذَهَبًا، فَقُلْتُ: لَا يَأْرَبُ! وَلَكِنْ أَشْبَعُ يَوْمًا وَأَجُوعُ يَوْمًا، فَإِذَا جَعْتُ تَضَرَّعْتُ إِلَيْكَ وَذَكَرْتُكَ وَإِذَا شَبِعْتَ حَمَدْتُكَ وَشَكَرْتُكَ“

(رواه الترمذي وحسنه)

ترجمہ: ”حضرت ابو اُمَامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے میرے سامنے یہ بات رکھی کہ میرے لیے وہ مکہ کی وادی کے سنگریزوں کو سونا بنادے (اور مجھے اس کا مالک بنادے) تو میں نے عرض کیا کہ: میرے پروردگار! میں اپنے لیے یہ نہیں مانگتا بلکہ میں (ایسی حالت میں رہنا پسند کرتا ہوں کہ) ایک دن پیٹ بھر کے کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں، پس جب مجھے بھوک لگے تو آپ کے سامنے گریہ وزاری کروں اور آپ کو یاد کروں، اور جب آپ کی طرف سے مجھے کھانا ملے اور میرا پیٹ بھرے تو میں آپ کی ستائش اور آپ کا شکر کروں۔“

کچے گھر میں رہنے کو ترجیح دینا اور پکا گھر طلبہ کے لیے وقف کر دینا
 شیخ ابن عثیمین رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ و استغناء کا یہ عالم تھا کہ شاہ خالد مرحوم نے اپنے زمانہ بادشاہت میں ”الجامع الکبیر“ سے متصل ان کے لیے ایک اچھا اور وسیع گھر بنانے کا حکم جاری کر دیا، تاکہ شیخ اپنے پرانے کچے گھر سے اس نئے گھر میں منتقل ہو جائیں، جب نیا گھر بن گیا اور شیخ سے کہا گیا کہ یہ گھر آپ کا ہے، تو انہوں نے ”وقف للطلاب“ کہہ کر اس عمارت کو ان طلبہ کے لیے وقف کر دیا جو دور دور سے آ کر اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے شیخ کے پاس قیام پذیر ہو جاتے اور خود

اپنے لیے پرانے اور کچے گھر میں رہنے کو ترجیح دی۔ احقر نے بھی اس وقف شدہ عمارت میں شیخ کی خدمت میں حاضری کے موقع پر مختصر قیام کیا تھا۔ اس عمارت میں طلبہ کے لیے رہائش اور کھانے پینے کے انتظام کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ لائبریری بھی موجود تھی، جہاں یکسوئی کے ساتھ طلبہ مطالعہ کرتے۔ شیخ اپنے کچے گھر میں قیام پذیر رہے، یہاں تک کہ شاہ فہد مرحوم کا زمانہ آیا، شاہ فہد نے بھی یہ محسوس کیا کہ سعودی عرب جیسے خوشحال ملک کے اتنے بڑے عالم دین کچے گھر میں رہیں! یہ ہرگز مناسب نہیں، چنانچہ انہوں نے مسجد سے کچھ فاصلے پر شیخ کے لیے دوسرا مکان بنانے کا حکم صادر کر دیا، جب وہ مکان تیار ہو گیا تو شیخ اس گھر میں پھر منتقل ہونے کے لیے تیار نہ تھے، البتہ ان کے استاد شیخ عبدالعزیز بن بازؒ نے ان کو منتقل ہونے کی دعوت و ترغیب دی، تب وہ منتقل ہو گئے، لیکن طرزِ حیات میں پھر بھی کوئی فرق نہیں آیا اور اپنی عمر کے آخری لمحات تک فقیرانہ زندگی گزارتے رہے۔

شیخ ابن عثیمینؒ کی قناعت و استغنا کا ایک اور واقعہ

احقر نے ڈاکٹر عبداللہ عبدالحسن التركي جنرل سیکریٹری رابطہ عالم اسلامی (سابق مدیر جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض) کا ایک عربی مضمون پڑھا تھا، جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ جب میں ”جامعۃ الإمام محمد بن سعود الإسلامیة“ کا مدیر تھا تو اس وقت ہم نے جامعہ کے تمام اساتذہ کے نام ایک فارم جاری کیا، جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ آپ اپنی تمام علمی سرگرمیوں کی وضاحت تحریر فرمائیں، چاہے وہ سرگرمیاں تصنیف و تالیف کے

میدان سے تعلق رکھتی ہوں، یا تدریس و تعلیم کے میدان سے یا دعوت و اصلاح کے میدان سے ان کی وابستگی ہو، تاکہ آئندہ ان سرگرمیوں اور صلاحیتوں کی بنیاد پر آپ کو ترقی دی جاسکے۔ شیخ ابن عثیمینؒ چونکہ منطقہ قصیم میں واقع جامعہ کی شاخ میں استاد تھے، اس لیے یہ فارم ان کی خدمت میں بھی بھیج دیا گیا تھا، آگے ہوا یہ کہ دیگر اساتذہ نے تو اپنی اپنی سرگرمیوں کو نمایاں طور پر تحریر فرما کر فارم واپس کر دیئے، لیکن شیخ کی طرف سے خالی فارم واپس آ گیا، میں (مدیر جامعہ) چونکہ ذاتی طور پر شیخ کی صلاحیتوں اور اعلیٰ علمی و اصلاحی سرگرمیوں سے واقف تھا، حیران رہ گیا کہ شیخ نے کیوں اپنی علمی سرگرمیوں اور تعلیمی و تصنیفی کارناموں کا کوئی تذکرہ نہیں فرمایا ہے؟ بالآخر میں نے ان سے رابطہ کیا کہ: شیخ محترم! آپ نے اپنی علمی سرگرمیوں اور اصلاحی و دعوتی کارناموں میں سے کسی کا ذکر نہیں فرمایا ہے اور خالی فارم واپس بھیج دیا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ شیخ نے فرمایا کہ: ”آپ نے اساتذہ کو اپنی اپنی سرگرمیاں تحریر کرنے کی وجہ یہ تحریر فرمائی ہے کہ ان سرگرمیوں کی بنیاد پر ان کو ترقی دی جائے گی، میں نہ تو ترقی کا خواہشمند ہوں اور نہ ہی میری جوتھوڑی بہت سرگرمیاں ہیں، وہ دنیوی ترقی پر فائز ہونے کے لیے ہیں، اس لیے میں نے کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھا۔“

سنتوں کا اہتمام اور کبھی کبھی ننگے پاؤں چلنا

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے، ملنے جلنے اور زندگی کے ہر پہلو میں اتباع سنت کا اہتمام فرماتے۔ ایک دفعہ میں شیخ

سے استفادہ کی غرض سے ”عُنَیْزہ“ شہر حاضر ہوا تھا، میں نے خود مشاہدہ کیا کہ شیخ ”الجامع الکبیر“ میں نماز پڑھانے کے بعد اپنے گھر کی طرف پیدل روانہ ہو گئے جو کہ مسجد سے تقریباً پون کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا، راستہ کہیں پکا اور کہیں کچا تھا، مسجد سے گھر جاتے ہوئے ان کے شاگردوں کی ایک جماعت بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی، تاکہ راستہ میں بھی اپنے شیخ سے استفادہ کرتے رہیں، میں بھی استفادہ کی غرض سے ان میں شامل ہو گیا، اس دوران میں نے دیکھا کہ شیخ ننگے پاؤں چل رہے ہیں جبکہ راستہ پورا پکا بھی نہیں تھا، کہیں کہیں مٹی بھی پڑی ہوئی تھی، شیخ کو ننگے پاؤں چلتے ہوئے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی! کیونکہ سعودی عرب میں مسجدوں سے چپل چوری ہونے کے واقعات نہ ہونے کے برابر تھے، پھر خیال آیا کہ شاید شیخ کے چپل ادھر ادھر ہو گئے ہوں گے یا کسی نے غلطی سے پہن لیے ہوں گے، اس لیے شیخ کو ننگے پاؤں چلنا پڑا ہوگا، ارادہ کیا کہ میں اپنا چپل ان کو پیش کروں، لیکن ان کے شاگردوں کا اطمینان دیکھ کر کچھ شک سا ہو گیا کہ یہ حضرات اپنے شیخ کو ننگے پاؤں چلتے دیکھ کر چونکتے کیوں نہیں؟ اپنے شک کو دور کرنے کے لیے میں نے ان کے ایک شاگردِ رشید سے پوچھا کہ شیخ ننگے پاؤں کیوں چل رہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ شیخ مندرجہ ذیل حدیث نبوی پر عمل کے لیے کبھی کبھی ننگے پاؤں چلا کرتے ہیں:

”حضرت عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابیؓ نے حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے - جو کہ مصر میں مقیم تھے - پوچھا کہ آپ کے بال بکھرے ہوئے کیوں ہیں؟ جبکہ آپ اس سرزمین کے امیر بھی ہیں، انہوں نے

فرمایا کہ: رسول اللہ ﷺ ہمیں زیادہ خوش عیشی سے روکا کرتے تھے۔ صحابیؓ نے ان سے پوچھا کہ: آپ کے پاؤں میں جوتا کیوں نہیں؟ فرمایا کہ: نبی ﷺ ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ وقتاً فوقتاً ننگے پاؤں چلا کرو۔“

(سنن ابوداؤد، کتاب الترجل، ج: ۲، ص: ۲۲۰۔ مشکاة المصابیح، ج: ۲، ص: ۳۸۲)

شیخ کے شاگرد رشید کی بات سن کر میں شرمندہ بھی ہوا اور اپنی غفلت پر نادم بھی، اور یہ احساس ہو گیا کہ مذکورہ حدیثِ پاک تو ہم نے بھی پڑھی تھی، لیکن اس پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے یاد نہیں رہی تھی، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو نبی کریم ﷺ کی تمام سنتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

شیخ ابن عثیمینؒ کی رقتِ قلبی کا ایک واقعہ

موصوف کی رقتِ قلبی کا ایک واقعہ جو ہفتہ وار عربی مجلہ ”المجتمع“ شمارہ نمبر: ۱۴۳۵، تاریخ: ۲۸ ماہ شوال تا ۵ ماہ ذوالقعدہ ۱۴۲۱ھ میں شائع ہوا ہے، ترجمہ کے بعد نقل کیا جا رہا ہے:

”سعودی عرب ریڈیو سے ایک دینی پروگرام ”نوذ علی الدرب“ کے نام سے نشر ہوتا ہے جس میں ملک کے مشہور علمائے کرام میں سے کسی عالم کو مدعو کیا جاتا ہے اور وہ لوگوں کے دینی سوالات کے جوابات دیتے ہیں، سوالات تحریری بھی ہوتے ہیں اور زبانی بھی، تحریری سوالات اس طرح ہوتے ہیں کہ پروگرام کے میزبان آئے ہوئے خطوط پڑھ کر سناتے ہیں اور زبانی سوالات اس طرح ہوتے ہیں کہ پروگرام کے دوران بذریعہ فون لوگ رابطہ کر کے سوال کرتے ہیں، اور بلائے گئے عالم دین جواب دیا کرتے ہیں، اس پروگرام کے لیے وقتاً فوقتاً شیخ ابن عثیمینؒ کو بھی بلایا جاتا تھا۔ ایک دفعہ کسی نے فون کر کے شیخ

سے عرض کیا کہ: میں نے ایک مختصر سا خواب دیکھا ہے، اس کی تعبیر بتادیجئے۔ شیخ نے فرمایا کہ: یہ پروگرام فقہی سوالات کے لیے ہے، خوابوں کی تعبیر کے لیے نہیں، اور مجھے خوابوں کی تعبیر سے زیادہ مناسبت بھی نہیں، اس لیے آپ مجھے معاف فرمائیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ شیخ! چونکہ آپ ہی پر میرا اعتماد ہے، لہذا ازراہ کرم آپ میرا یہ مختصر خواب سن لیجئے اور اگر کوئی تعبیر ذہن میں آجائے وہ بھی بتادیجئے۔ شیخ نے ان کے اس اصرار پر کہا کہ بتادیجئے! آپ نے کیا خواب دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا کہ: اپنے ایک جاننے والے شخص کو میں نے خواب میں اس طرح دیکھا ہے کہ وہ کعبۃ اللہ کے ارد گرد نگاہوں کو طواف کر رہا ہوتا ہے۔ شیخ نے علی الفور تعبیر بتادی کہ اس خواب سے اس شخص کی عظمت اور قربتِ خداوندی کا پتہ چل رہا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت فرمائی ہے، اس لیے کہ حدیثِ نبوی ہے: ”مَنْ حَجَّ لِلَّهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمَ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ“ (متفق علیہ) یعنی ”جس نے اللہ کے لیے حج کیا پھر اس میں شہوت اور گناہ کی بات نہیں کی تو وہ اس دن کی طرح ہو کر لوٹے گا جس دن اس کی ماں نے اُسے جنا تھا۔“

مذکورہ حدیث میں مکمل مغفرت سے تعبیر اس طرح کی گئی ہے کہ انسان گناہوں سے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسا کہ ولادت کے وقت اس کی حالت ہوتی ہے، اور ظاہر بات ہے کہ ولادت کے وقت آدمی کے جسم پر کپڑا تو نہیں ہوتا، لہذا! اس خواب سے اس شخص کی عظمت اور دربارِ الہی میں مقرب ہونے کا پتہ چلتا ہے جس کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے۔ اس پر خواب دیکھنے والی شخصیت نے کہا کہ شیخ محترم! مبارک ہو، جس شخص کو میں نے مذکورہ حالت میں طواف کرتے ہوئے خواب میں دیکھا ہے، وہ آپ ہی (شیخ محمد بن صالح العثیمین) تھے، یہ سنتے ہی شیخ

پر ایسی رقت اور رونے کی کیفیت طاری ہوگئی کہ ان کے لیے بولنا مشکل ہو گیا اور اس دن اپنے پروگرام ”نوڈ علی الدرب“ کو بھی پورا نہ کر سکے اور واپس تشریف لے گئے۔“

افہام و تفہیم میں یکتا

شیخ ابن عثیمین رحمۃ اللہ تعالیٰ نے افہام و تفہیم کا خصوصی ملکہ عطا فرمایا تھا، جب وہ ”الجامع الکبیر، عنیزہ“ یا مسجد حرام کی دوسری منزل پر فصیح و بلیغ عربی زباں میں درس دیا کرتے تو ان کے سمجھانے کے منفرد انداز کی بدولت شرکاء ہمہ تن گوش رہتے اور خاص و عام بہ یک وقت مستفید ہو جاتے، شیخ اپنے درس کے دوران طلبہ سے سابقہ دروس سے متعلق سوالات بھی کرتے، تاکہ وہ غور سے سنا کریں اور دروس کو یاد بھی رکھا کریں۔

احقر کو اپنی تعلیمی زندگی میں چار شخصیات کے اندازِ تدریس نے کافی متاثر کیا ہے، ان شخصیات میں سرفہرست حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری صدر المدرسین و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم ہیں۔ جن سے احقر نے اپنی تعلیمی زندگی میں سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب مشکل سے مشکل مسئلہ کو محسوس مثالوں کے ذریعہ اس انداز پر سمجھا دیتے کہ اعلیٰ اور متوسط صلاحیت والے طلبہ کے ساتھ ساتھ ادنیٰ صلاحیت والے بھی آسانی سے سمجھ جاتے۔

دوسری شخصیت شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، جن کے دروس میں احقر

کو چند دفعہ شرکت کی سعادت نصیب ہوئی اور ان کی فصیح عربی زبان اور سمجھانے کے منفرد انداز نے کافی متاثر کیا۔

تیسری شخصیت استاذ حسن خمیس الملیجی کی تھی جن سے ”جامعة الملك سعود ریاض“ میں احقر اور اس کے ہم جماعت ساتھیوں نے عربی ادب کا درس لیا۔ موصوف کا تعلق مصر سے تھا اور عربی ادب میں مہارت کے ساتھ ساتھ سمجھانے کی صلاحیت اور خوش مزاجی کی صفت سے بھی خوب مالا مال تھے۔ میں اپنے ساتھیوں سے کبھی ان کے بارہ میں کہا کرتا تھا کہ ہمارے محترم استاذ کے افہام و تفہیم کا انداز تو ایسا لگتا ہے کہ گویا وہ زیر بحث موضوع کا ایک خوبصورت و باذائقہ لقمہ بنا کر طالب علم کے منہ میں رکھ دیتے ہیں، ساتھی میری اس گفتگو اور مثال سے اتفاق کر لیتے۔

چوتھی شخصیت حضرت مولانا سلیم اللہ خاں صاحب مدظلہم العالی (اور اب بہ وقتِ اشاعت ”رحمہ اللہ“ متوفی: ۱۷/۴/۱۴۳۸ھ) صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان اور بانی جامعہ فاروقیہ کراچی کی ہے، جن سے باضابطہ طور پر احقر کو پڑھنے کا موقع تو نہیں مل سکا ہے، البتہ ان کے بخاری شریف کے صرف ایک سبق میں ایک مرتبہ شرکت کا موقع ملا، جس سے ان کے افہام و تفہیم کے طریقہ کا اندازہ ہوا، موصوف نہایت سہل انداز میں مسائل کو حل کر لیتے اور طلبہ بہ آسانی ان کی بات کو سمجھ لیتے، اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں صحت و عافیت کے ساتھ برکت عطا فرمائے (اور اب یہ دعا کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے)۔

ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین کا ادب و احترام

شیخ محمد بن صالح العثیمینؒ اگرچہ فرعی مسائل میں اکثر مذہبِ حنبلی کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے، تاہم وہ اپنے آپ کو مقلد یا کلی طور پر کسی متعین مذہب کے متبع نہیں کہتے تھے، بلکہ وہ اپنی رائے میں جس دلیل کو قوی سمجھتے تھے اُسی کو ترجیح دینے کے قائل تھے۔ شیخ اور اُن کے ہم مشرب سعودی عرب کے دیگر علمائے کرام کا مذکورہ بالا نقطہ نظر اگرچہ جمہور علمائے امت کے نقطہ نظر سے مختلف ہے، جن کا مسلک یہ ہے کہ اس دورِ انحطاط اور زمانہ خود غرضی و فساد کے اندر مذاہبِ اربعہ مروجہ میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے اور اس کے اصول و فروع کی پابندی کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں، اور اُن کی آراء کو چھوڑ کر دلیلِ قوی تک پہنچنا اگرچہ ناممکن نہیں، مشکل ضرور ہے۔ راقم بھی ان ہی جمہور علماء کا خوشہ چین اور ان کے شاگردوں میں سے ایک ادنیٰ شاگرد ہے، اس لیے وہ بھی شیخ ابن عثیمین رحمۃ اللہ علیہ والے مسلک سے اتفاق نہیں کر سکتا، تاہم یہ نا انصافی ہوگی کہ شیخ کی اس خصوصیت و خوبی کو نظر انداز کیا جائے کہ وہ اپنے مذکورہ نقطہ نظر کے باوجود ائمہ اربعہ اور ان کی اتباع کرنے والے اہل علم کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کے علمی مقام کے معترف اور تقویٰ و طہارت کے قائل تھے۔

شیخ کے شاگردوں میں سے ایک پکے حنفی المذہب شخص مولوی ہدایت اللہ صاحب زید مجدہم نے براہِ راست مجھے بتایا کہ میں تقریباً چھ سال تک شیخ کے پاس مقیم رہ کر ان سے پڑھتا رہا اور اُن کے پیچھے نمازیں پڑھتا رہا، ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میں نمازوں میں رفعِ یدین نہیں کرتا اور بوقتِ قیام اپنے ہاتھوں کو ناف سے نیچے باندھتا ہوں اور اوقاتِ مکروہہ میں تحیۃ المسجد نہیں پڑھتا وغیرہ، لیکن

چونکہ ان کو یہ معلوم تھا کہ میں حنفی المذہب ہوں اور حنفی مسلک کے مطابق عمل کر رہا ہوں، اس لیے مجھے کبھی نہیں ٹوکا، بلکہ اگر کوئی دوسرا شخص مجھے ٹوکنے کی کوشش کرتا اس کو بھی منع کر دیتے۔

اسی طرح کوئٹہ بلوچستان کے رہنے والے جناب بھائی علاء الدین صاحب تقریباً سترہ سال تک شیخ کی زندگی میں ان کے پاس مقیم رہے اور ان کے طلبہ کی خدمت پر مامور رہے اور تادم تحریر ”الجامع الکبیر“ سے متصل عمارت میں مقیم ہیں، حال ہی میں وہ پاکستان آئے ہوئے تھے تو میں نے ان سے شیخ کے کچھ حالات معلوم کیے، وہ شیخ کا نام سن کر اپنی آنکھوں پر قابو نہ پاسکے اور بتانے لگے کہ: ”ایسا علم دوست اور شفیق و ہمدرد شخص میں نے اپنی زندگی میں ان کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا ہے، جب ان کو کسی طالب علم کے بارہ میں یہ اندازہ ہو جاتا کہ یہ صحیح معنوں میں طلب علم میں لگا ہوا ہے تو اس کو اپنے بیٹے سے بھی زیادہ اہمیت دیتے اور ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کا متبع شخص اگر ان سے مسئلہ معلوم کر لیتا اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ فلاں مسلک کا متبع ہے تو اُسے اس کے مسلک کے مطابق جواب دیتے اور کبھی اس پر ناراضگی کا اظہار نہ فرماتے۔“

کینسر کا عارضہ اور بیرون ملک علاج سے انکار

شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی زندگی کے آخری دو سالوں میں کینسر کا عارضہ لاحق ہو گیا، اس حالت میں بھی انہوں نے اپنے معمولات کو برقرار رکھا اور صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی رہے۔ سعودی حکومت نے بارہا بیرون ملک علاج کرانے کی پیشکش کی، جسے وہ ٹالتے رہے، بالآخر حکومت اور بعض متعلقین

کے اصرار پر بادل ناخواستہ تیار ہو گئے اور حکومت کی طرف سے امریکا میں ان کے علاج کا بندوبست کیا گیا، لیکن وہاں پر پہنچنے کے بعد ڈاکٹروں کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ علاج کی صورت میں دواؤں کی شدت سے ان کے بال جھڑ جائیں گے، اس پر شیخ نے یہ کہتے ہوئے علاج سے انکار کر دیا کہ موت تو برحق اور اس کا وقت مقرر ہے، میں ایسا علاج نہیں کرانا چاہتا جس سے میری داڑھی کے بال نہ رہیں اور میں داڑھی کے بغیر قبر میں پہنچ جاؤں! لہذا علاج کرائے بغیر واپس تشریف لائے، اور اپنے معمولات کو بیماری کی شدت کے باوجود جاری رکھنے کی کوشش فرماتے رہے، جب بیماری نے زیادہ شدت اختیار کی تو جدہ کے ایک ہسپتال ”المستشفى التخصصی“ میں ان کو داخل کرایا گیا، چنانچہ ماہِ رمضان کے آخری ایام میں وہ مذکورہ ہسپتال میں رہے۔ ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ رمضان کی آخری رات میں انہوں نے مسجد حرام جانے کا اصرار شروع کیا اور فرمایا کہ: مجھے رمضان کی برکات سے محروم نہ کریں، لہذا ان کے اصرار پر اسٹریچر پر لیٹے ہوئے ایسی حالت میں ان کو مسجد حرام منتقل کیا گیا کہ آکسیجن کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں، اسی حالت میں مسجد حرام میں مغرب وعشاء کی نمازیں ادا کیں اور تراویح کے بعد اپنے سابقہ معمول کے مطابق لاؤڈ اسپیکر کا تقاضا کیا اور درس دینے لگے، ڈاکٹر تو ان کے ضعف و نقاہت اور بیماری کی کیفیت کو دیکھ کر سخت اضطراب میں مبتلا تھے، لیکن شیخ اطمینان کے ساتھ درس دیتے رہے، یہ مسجد حرام میں ان کی زندگی کا آخری درس تھا، اس لیے کہ عید کے دن پھر ان کو مذکورہ ہسپتال منتقل کیا گیا، جہاں چند ہی دن بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

شیخ کی ولادت و تعلیم و تعلّم

شیخ محمد بن صالح العثیمینؒ کی ولادت ۲۷/۹/۱۳۴۷ھ کو منطقہ ”قصیم“ میں واقع ”عنیزہ“ شہر میں ہوئی، اور جیسے ہی پڑھنے کے قابل ہوئے تو والد ماجد نے دینی تعلیم میں لگا دیا، چنانچہ بچپن ہی میں قرآن پاک کا حفظ مکمل کیا، پھر فضیلۃ الشیخ عبدالرحمن بن ناصر السعدی سے صرف و نحو، تفسیر و حدیث، سیرت و عقیدہ، فقہ و اصول فقہ اور علم میراث کی تعلیم حاصل کی، پھر اپنے مذکورہ شیخ کی اجازت سے ”المعهد العلمی“ ریاض میں داخل ہوئے اور فضیلۃ الشیخ المفسر محمد الایمن الشنقیطی اور فضیلۃ الشیخ الفقیہ عبدالعزیز بن ناصر جیسے اہل علم سے استفادہ کیا، اُسی دورانِ سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن بازؒ سے تعلق پیدا ہوا اور مسجد میں ان سے بخاری شریف اور دیگر مختلف کتابیں پڑھیں اور شیخ عبدالرحمن السعدیؒ کے بعد سب سے زیادہ استفادہ شیخ ابن بازؒ سے کیا اور اسی وجہ سے شیخ عبدالرحمن السعدیؒ کو ان کے شیخ اول اور شیخ ابن بازؒ کو ان کے شیخ ثانی کہا جاتا ہے۔

درس و تدریس اور تصنیف و تالیف

فراغت کے بعد اپنے شیخ اول کے حکم سے ”المعهد العلمی عنیزہ“ میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا، ۱۳۷۶ھ کو ان کے شیخ اول کا انتقال ہوا تو ان کو اپنے شیخ اول کی جگہ ”الجامع الکبیر عنیزہ“ میں امام و خطیب مقرر کیا گیا، جہاں امامت و خطابت کے ساتھ ساتھ تدریس کی ذمہ داری بھی نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی وفات تک انجام دیتے رہے، اور ۱۳۹۸ھ سے اپنی وفات تک ”کلیۃ الشریعہ، جامعۃ

الإمام محمد بن سعود الإسلامية“ (شاخ قصیم) میں بھی تدریس کی ذمہ داری انجام دیتے رہے، اس کے علاوہ ماہِ رمضان اور ایامِ حج اور سالانہ چھٹیوں میں مسجدِ حرام کی دوسری منزل میں ان کا حلقہٴ درس ہوتا تھا، جس میں بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے۔ شیخ ابن عثیمین ”انجمن کبار العلماء“ کے رکنِ رکنین اور چالیس سے زیادہ کتابوں اور رسائل کے مؤلف بھی تھے۔ ان کے بے شمار شاگرد ملک و بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ پڑھانے کے ساتھ ساتھ اپنی گفتار و کردار کے ذریعہ طلبہ کی تربیت پر بھی خوب توجہ دیتے تھے۔ ان کے سامنے قضاء کا منصب بھی پیش کیا گیا، لیکن انہوں نے قبول کرنے سے معذرت کی۔

شیخ ابن عثیمینؒ کا وصیت نامہ

شیخ نے اپنی وفات سے پہلے اپنی اولاد اور طلبہ کے لیے ان کی خواہش پر مندرجہ ذیل وصیت نامہ تحریر فرمایا:

”اللہ تعالیٰ کے ساتھ آپ کا معاملہ کیسا ہو؟“

۱:..... اللہ تعالیٰ کو ہر حالت میں یاد رکھئے اور اس کی قدرت کی نشانیوں جیسے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور ان میں اللہ کی پوشیدہ حکمتوں، رحمتوں اور احسانات پر غور کیجئے اور اللہ تعالیٰ کے ان احکام شرعیہ پر بھی غور کیجئے جن کے ساتھ اپنے انبیاء اور بالخصوص خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا ہے۔

۲:..... آپ کا دل اللہ کی محبت سے اتنا لبریز ہونا چاہیے کہ اس کی محبت سب پر غالب رہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے شمار انعامات سے نوازا ہے،

بالخصوص ایمان اور دین پر استقامت کی نعمت سے، اور شرور و فتن سے بچایا ہے۔

۳:..... آپ کے قلب میں اللہ کی بے پناہ محبت کا یہ اثر ہونا چاہیے کہ آپ اللہ کے تمام اوامر کی پابندی کریں اور منہیات سے اجتناب کریں۔

۴:..... اللہ کی تمام عبادات میں اخلاص کا استحضار رکھئے اور اپنی زندگی کے تمام امور میں اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کا اہتمام کیجئے، تاکہ آپ ”إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ“ کہنے میں سچے ثابت ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کے حق میں آپ کا معاملہ کیسا ہو؟

۱:..... اللہ کی مخلوق میں نبی ﷺ کی محبت دیگر تمام محبتوں پر غالب رہے اور آپ ﷺ کے ہر طریقہ و سنت کو دوسرے لوگوں کے طریقوں پر ترجیح دیجئے۔

۲:..... تمام عبادات و اخلاق میں آپ ﷺ کو اپنا پیشوا بنالیں اور ہر عبادت میں اس بات کا استحضار رکھئے کہ آپ ان ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، اسی طرح لوگوں سے ملنے جلنے میں بھی آپ ﷺ کے اخلاق فاضلہ کی پیروی کیجئے جن سے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خَلْقٍ عَظِيمٍ“ (اور بے شک تم اخلاق کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو) مذکورہ اہتمام سے آپ کے اندر نبی ﷺ کی شریعت سمجھنے اور آپ کے اخلاق جاننے کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

۳:..... نبی ﷺ کی سنتوں کا دفاع کیجئے اور لوگوں کو ان کی طرف بلانے اور دعوت دینے کا اہتمام کیجئے اور آپ جتنا بھی شریعتِ مصطفویٰ کا دفاع کریں گے، اللہ تعالیٰ اتنا ہی آپ کے ساتھ تعاون فرمائیں گے۔

فرائض کے علاوہ آپ کے روزمرہ معمولات کیا ہوں؟

۱:.....رات کے آخری حصہ میں اُٹھ کر اللہ کو یاد کیجئے اور اللہ سے جو چاہیں مانگیں، اس لیے کہ رات کا وہ حصہ دعا کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے اور سورہ آل عمران کی آخری آیتیں ”إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ سے لے کر اختتامِ سورت تک پڑھا کیجئے۔

۲:.....رات کے آخری حصہ میں تہجد کی نماز جتنی ہو سکے ادا کیجئے اور آخر میں وتر پڑھا کیجئے۔

۳:.....صبح کے ذکر و اذکار کی پابندی کیجئے، ایک سو دفعہ ”لا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير“ پڑھا کیجئے۔

۴:.....اشراق کی دو رکعت نماز پڑھا کیجئے۔

۵:.....شام کے ذکر و اذکار کی حسبِ توفیق پابندی کیجئے۔

علم حاصل کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

۱:.....حفظِ قرآن کا اہتمام کیجئے اور روزانہ ایک متعین حصہ کی تلاوت پابندی اور غور و خوض کے ساتھ کیجئے، اور تلاوت کے دوران جو علمی فوائد ذہن میں آجائیں، انہیں قلمبند کیجئے۔

۲:.....مستند احادیثِ نبویہ میں سے جتنی حدیثیں حفظ کر سکتے ہیں کر لیجئے، اور بالخصوص ”عمدة الأحكام“ (تالیف: حافظ عبد الغنی مقدسی رحمۃ اللہ علیہ) حفظ کرنے کی کوشش کیجئے۔

۳:..... علم پوری توجہ و ترتیب کے ساتھ حاصل کیجیے، ایسا نہ ہو کہ کچھ ادھر سے لیا، کچھ اُدھر سے لیا، اس لیے کہ اس سے آپ کا وقت ضائع ہوگا اور ذہن بھی تردد میں مبتلا ہوگا۔

۴:..... ہر فن کی ابتدائی کتابیں پوری توجہ کے ساتھ پڑھئے، پھر بتدریج آگے بڑھتے رہیے، تاکہ علم میں پختگی اور اطمینان پیدا ہو جائے۔

۵:..... ہر فن کے اصول و قواعد کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کیجئے اور اہم باتوں کو قلمبند بھی کیجئے، مشہور مثال ہے: ”من حُرِمَ الْأُصُولَ حُرِمَ الْوُصُولُ“ (جو اصول و قواعد سے محروم ہو وہ منزل مقصود تک پہنچنے سے محروم ہوا)۔

۶:..... اپنے استاد یا قابل اعتماد ذی علم ساتھیوں میں سے کسی کے ساتھ علمی مسائل میں بحث و مباحثہ کا اہتمام کیجئے اور اگر علمی مباحثہ کے لیے کوئی میسر نہ ہو تو اپنے ذہن میں یہ تصور قائم کیجئے کہ علمی مسائل کے اندر آپ کے ساتھ کوئی بحث و مباحثہ کر رہا ہے، تاکہ آپ مسائل کی گہرائی تک پہنچ سکیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو علمِ نافع و عملِ صالح عطا فرمائے اور آپ کے علم میں اضافہ کر دے اور آپ کو نیک اور کامیاب لوگوں میں شامل فرمادے۔ والسلام

علیکم ورحمة الله وبرکاته

شیخ کی وفات اور مسجدِ حرام میں نمازِ جنازہ

فضیلۃ الشیخ العلامة محمد بن صالح العثیمینؒ نے اس دارِ فانی میں تقریباً پچتر سال کی زندگی گزار کر بروز بدھ ۱۵/۱۰/۱۴۲۱ھ مطابق ۱۰/۱/۲۰۰۱ء کو مغرب

سے ذرا پہلے شہر جدہ میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور اگلے دن عصر کی نماز کے بعد مسجد حرام میں امام حرم فضیلۃ الشیخ محمد بن عبد اللہ السُّبَیِّل کی امامت میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی، جس میں سعودی اخبارات کے مطابق تقریباً پانچ لاکھ آدمیوں نے شرکت کی، جو خصوصی گاڑیوں، بسوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ ملک کے طول و عرض سے ان کی نماز جنازہ میں شرکت کے لیے مسجد حرام پہنچے تھے۔ بعد نماز جنازہ ان کے جسد خاکی کو مکہ مکرمہ کے قبرستان ”مقبرة العدل“ میں سپردِ خاک کیا گیا، جہاں ان کے محترم استاذ سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کو سپردِ خاک کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

شیخ عبد اللہ بن عبد الرحمن بن جبرین رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ اور ان کا مختصر تذکرہ

فضیلۃ الشیخ الدکتور عبد اللہ بن عبد الرحمن بن جبرین رحمۃ اللہ علیہ بھی سعودی عرب کے مایہ ناز اور مشہور علماء میں سے تھے، علمی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ان کی سادگی اور دنیا سے بے رغبتی ضرب المثل تھی، ”جامعۃ الملک سعود“ میں قیام کے دوران احقر اپنے مخلص دوستوں اور ساتھیوں کے ذریعہ غائبانہ طور پر ان کی علمی صلاحیتوں اور زہد و تقویٰ سے واقف ہو چکا تھا اور یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ریاض کی مختلف مساجد میں وہ درس دیا کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کے بیانات ہوتے ہیں، میری ایک دلی تمنا تھی کہ ان کی خدمت میں حاضری اور ان سے استفادہ کا کوئی موقع میسر آ جائے، حسن اتفاق سے ایک دن ”جامعۃ الملک سعود“ کی مرکزی جامع مسجد میں اعلان آویزاں ہو گیا کہ بروز اتوار ۱۱/رجب ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۸ فروری ۱۹۸۸ء عصر کی نماز کے بعد ”اہمیۃ عمارة المساجد عمارة معنویۃ“ (مسجدوں کو معنوی طور پر آباد کرنے کی اہمیت) کے موضوع پر فضیلۃ الشیخ الدکتور عبد اللہ بن عبد الرحمن بن جبرین کا خطاب ہوگا، اس اعلان کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا اور اتوار کے دن کا انتظار کرتا رہا، اتوار کو عصر سے پہلے مذکورہ مسجد پہنچ کر میں نے

دیکھا کہ شیخ کا بیان سننے کے لیے عام دنوں کے اعتبار سے لوگوں کی زیادہ تعداد اس مسجد کی طرف متوجہ ہے، ان لوگوں کے درمیان میں نے یہ بھی دیکھا کہ عربی لباس میں ملبوس ایک معمر شخص اسی مسجد کی طرف جا رہے ہیں اور لباس و رفتار میں اتنی سادگی ہے کہ میرے ذہن میں یہ آیا کہ غالباً یہ ایک عام دیہاتی شخص ہیں جن کو یہ معلوم ہوا ہوگا کہ یہاں پر شیخ ابن جبرین کا بیان ہونے والا ہے، اس لیے وہ بھی سننے کے لیے آگئے اور دل میں یہ بھی آ رہا تھا کہ یہ بے چارے سیدھے سادے دیہاتی شخص اتنے بڑے شیخ کا علمی بیان کیسے سمجھیں گے؟

بہر صورت! عصر کی نماز ادا کی گئی اور امام مسجد نے اعلان کیا کہ فضیلۃ الشیخ عبد اللہ بن عبد الرحمن بن جبرین کا بیان ہونے والا ہے، آپ حضرات شرکت فرمائیں اور یہ بھی کہا کہ شیخ سے درخواست ہے کہ آگے منبر کی طرف تشریف لے آئیں، اس اعلان کے بعد احقر کی نگاہیں اس تجسس میں لگی ہوئی تھیں کہ کون شخص منبر کی طرف بڑھتے ہیں، اتنے میں وہی شخص جن کو میں دیہاتی سمجھ رہا تھا آگے بڑھے اور منبر پر تشریف فرما ہوئے، مجھے اپنی خام خیالی پر دل دل میں ندامت و شرمندگی محسوس ہوئی، اس لیے کہ جن کو میں ایک معمولی شخص سمجھ رہا تھا، وہی فضیلۃ الشیخ عبد اللہ بن جبرین تھے۔

ان کی خاکساری اور سادگی کو دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ سعودی عرب جیسے خوشحال ملک کے اندر اتنے مشہور و جلیل القدر عالم دین کی اتنی فروتنی و خاکساری اس بات کی واضح دلیل ہے کہ انہوں نے دنیا کی بے وقعتی اور آخرت کی اہمیت کا صحیح معنوں میں ادراک کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی مستعار زندگی کے قیمتی

لمحات اور اپنی صلاحیتوں کو دنیوی خواہشات و ذاتی مفادات میں ضائع کرنے کے ہرگز قائل نہیں، بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ زندگی کا ہر لمحہ اللہ کی رضا اور دین کی خدمت میں خرچ ہو۔

شیخ نے فصیح عربی زباں اور بے تکلف انداز میں مساجد کی اہمیت اور ان کو معنوی طور پر آباد کرنے سے متعلق قرآن و سنت اور سلفِ صالحین کے اقوال و واقعات کی روشنی میں علمی بیان کیا اور لوگوں کو ترغیب دی کہ مساجد کو نماز و عبادت اور تعلیم و دعوت الی اللہ کے ذریعہ آباد کرنے کی کوشش کریں۔ شیخ کے اندازِ بیان سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے دل میں ایک درد ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ہر مسلمان اپنے دین پر استقامت کے ساتھ قائم رہے اور مساجد پانچوں اوقات میں نمازیوں سے آباد رہیں، اور چونکہ کندھے سے کندھا ملا کر باجماعت نماز ادا کرنے سے مسلمانوں کو آپس میں اتحاد و اتفاق کا درس ملتا ہے، اس لیے مسلمان اس درس کو ہمیشہ یاد رکھیں اور اس کو عملی جامہ ضرور پہنائیں۔

شیخ ابن جبرین سے احقر کی یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی، دلی تمنا کے باوجود دوبارہ ان سے ملاقات یا ان کے کسی درس میں شرکت کی سعادت حاصل نہ کر سکا، البتہ ان کے شاگردوں اور جاننے والوں سے ان کے واقعات و احوال دریافت کرتا رہتا۔ ایک دفعہ ایک با اعتماد سعودی ساتھی نے ان کی خاکساری کا ایک عجیب واقعہ سنایا، اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ شیخ کسی ریش والی جگہ میں گزرگاہ کے کنارے کسی کے انتظار میں زمین پر بیٹھے ہوئے تھے، اتفاق سے وہاں پولیس والوں کی گاڑی گزر رہی تھی، پولیس والوں کو ان کے سادہ لباس اور گزرگاہ کے کنارے بیٹھنے سے

شبہ ہوا کہ یہ کوئی مانگنے والا شخص ہے، پولیس والے شیخ کے نام سے تو واقف تھے، البتہ شکل و صورت سے ان کو نہیں جانتے تھے اور نہ ہی یہ اندازہ کر سکے کہ یہ کوئی عالمِ دین ہیں، اور چونکہ سعودی عرب میں سوال کرنا منع ہے، اس لیے ان کو سائل سمجھ کر گاڑی میں بٹھا کر پولیس اسٹیشن لے گئے، پولیس اسٹیشن میں موجود افسر جو شیخ کو جانتے تھے، بے حد شرمندہ ہوئے اور معافیاں مانگنے لگے اور اپنے ماتحتوں کو ڈانٹا کہ تمہیں پتہ بھی ہے کہ یہ کون ہیں؟ شیخ نے کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا، بلکہ سب کو معاف کر دیا۔

شیخ کی سخاوت و رحم دلی

موصوف کے شاگردوں میں سے ایک نوجواں شاگرد شیخ اسحاق بن ہارون الرشید ہیں، جو مکہ مکرمہ میں مقیم اور مسجد حرام میں مدرس ہیں، ان کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ شیخ بے انتہا رحم دل اور صاحبِ سخاوت انسان تھے، جب کسی شخص کے بارہ میں ان کو معلوم ہوتا کہ وہ حاجت مند ہے اور اس کو اور اس کے خاندان کو کھانے پینے کے سامان کی ضرورت ہے تو ضروری سامان لے کر اس کے گھر پہنچ جاتے اور گھر کے دروازے کے ساتھ سامان رکھ کر دستک دے دیتے اور چلے جاتے، تاکہ ضرورت مند کو سامان بھی ملے اور یہ بھی پتہ نہ چلے کہ یہ کس نے دیا ہے؟ شیخ اسحاق نے اپنے استاذ محترم فضیلۃ الشیخ ابن جبرین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ بھی بتایا کہ ایک مرتبہ وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ مکہ مکرمہ جا رہے تھے، سفر کے دوران کسی سائل نے ان سے کچھ مانگا، انہوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سائل کو دینے کے لیے کوئی

چھوٹا نوٹ تلاش کیا، لیکن اتفاق سے پانچ سو ریال کا نوٹ نکل آیا، جسے سائل نے دیکھ لیا، شیخ نے انہیں دوبارہ جیب میں ڈال کر چھوٹا نوٹ تلاش کرنا چاہا، اس دوران انہیں محسوس ہوا کہ سائل کے چہرہ پر مایوسی چھا گئی، شیخ نے مایوسی کی تلافی کے لیے پھر سے وہی پانچ سو کا نوٹ نکال کر سائل کو دے دیا۔

احقر کو فضیلۃ الشیخ ابن جبرین رحمۃ اللہ علیہ کی اس ایک ملاقات اور ایک بیان میں شرکت کرنے اور دوستوں و ساتھیوں سے ان کے مذکورہ بالا جیسے عبرت انگیز واقعات سننے سے بڑا فائدہ محسوس ہوا، اور آج تک جب بھی دنیا کی زیب و زینت اور اس کی آرائش و رعنائیت میں پھنسنے کے مواقع سامنے آتے ہیں تو شیخ ابن جبرین رحمۃ اللہ علیہ اور ان جیسے دیگر اکابرین کی سادگی اور دنیا سے بے رغبتی کو یاد کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور میں دنیا کی محبت سے نجات کی دعا کرتا ہوں۔

شیخ ابن جبرینؒ کی تاریخ ولادت و وفات

فضیلۃ الشیخ الدکتور عبداللہ بن عبدالرحمن بن جبرین کی ولادت ان کے شاگرد شیخ اسحاق کے بقول ۱۳۴۹ھ کو اور عربی ماہنامہ ”مجلة الحج والعمرة“ ماہ رمضان ۱۴۳۰ھ کی تصریح کے مطابق ۱۳۵۲ھ کو ہوئی تھی، اور انہوں نے اپنی مستعار زندگی کے تقریباً اٹھتر یا اکیاسی سال اس دنیائے فانی میں گزار کر نیک اعمال کے ایک بڑے ذخیرہ کے ساتھ ۲۰ رجب ۱۴۳۰ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ عطا فرمائے۔

حضرت شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کا موقع اور اُن کا تذکرہ خیر

اس سے پہلے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ”جامعۃ الملک سعود ریاض“ میں احقر کے داخلہ لینے کے چار بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد فضیلۃ الشیخ عبدالفتاح ابو غدہ الحلبي الشامی الحنفی قدس سرہ سے خصوصی طور پر استفادہ کرنا تھا، شیخ کا ذکر خیر احقر نے پہلی بار دارالعلوم دیوبند میں اپنے استاذ مکرم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم سے اس وقت سنا تھا جب میں دورہ حدیث کا طالب علم تھا، حضرت مفتی صاحب وقتاً فوقتاً دورانِ سبق ان کا ذکر خیر اور اُن کی تصانیف کا حوالہ دیا کرتے تھے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ وہ ایک زبردست محدث و فقیہ اور حنفی المذہب عالم ہیں اور ہمارے اکابرین کے بے حد معتقد ہیں، دارالعلوم دیوبند سے گہری محبت رکھتے ہیں اور دارالعلوم تشریف بھی لائے ہیں۔

فراغت کے بعد جب اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں احقر کا تقرر ہوا تو اس وقت شیخ ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف اور ان کے علمی مقام سے مزید آگاہی ہوئی اور حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”التصريح بما تواتر في نزول المسيح“ اور حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ”مقدمۃ إعلاء

السنن“، اور حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”الرفع والتکمیل فی الجرح والتعديل“ اور ان کی دوسری کتاب ”الأجوبة الفاضلة“ پر شیخ کی بے نظیر تحقیق و تعلیق اور دارالعلوم دیوبند اور ہمارے اکابرین سے متعلق ان کے عقیدت مندانہ تاثرات کا انکشاف بھی ہوا، لہذا غائبانہ طور پر ان سے محبت و عقیدت پیدا ہو گئی اور یہ بھی پتہ چلا کہ وہ ”جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية ریاض“ میں استاذ ہیں، مذکورہ جامعہ میں داخلہ لینے کی صورت نہیں بن رہی تھی، البتہ ”جامعة الملك سعود ریاض“ میں داخلہ کی صورت بن گئی اور اس بہانے شیخ ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات اور ان کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضری کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہونے کی امید پیدا ہو گئی۔

شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ سے پہلی ملاقات

جب احقر کا داخلہ ”جامعة الملك سعود ریاض“ میں ہو گیا اور ۳۰ محرم ۱۴۰۸ھ کو ریاض پہنچ کر مذکورہ جامعہ میں مقیم ہو گیا، تو بالکل ابتدائی دنوں کی بات ہے کہ مجھے معلوم ہوا کہ جامعہ کے قریب کتابوں کی ایک عالمی نمائش لگی ہوئی ہے، جس میں مختلف قسم کی کتابیں مل سکتی ہیں۔ راقم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ایک دن مغرب و عشاء کے درمیان اس نمائش میں پہنچ گیا اور کتابوں کی تلاش میں مصروف ہو گیا، اُسی دوران ایک سفید ریش سرخ و سفید نورانی چہرہ والے ایسے شخص کو لگن کے ساتھ کتابوں کو تلاش کرتے ہوئے میں نے دیکھا جن کے چہرے سے علم و تقویٰ، خوش اخلاقی و اخلاص اور ہمدردی و دیانت داری کے جلوے پھوٹ

رہے تھے، ایک ساتھی نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ جانتا تو نہیں، لیکن ان کا چہرہ یہ بتا رہا ہے کہ وہ ایک غیر معمولی صلاحیت و تقویٰ کے مالک شخص ہوں گے، ساتھی نے کہا کہ: یہ مشہور و معروف حنفی عالم دین شیخ عبدالفتاح ابو غدہ ہیں، میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور فوراً آگے بڑھا اور ادب و احترام کے ساتھ سلام کر کے ان سے مصافحہ و معانقہ کیا اور مزاج پرسی کی، شیخ نے بھی بہت ہی شفقت و محبت کے انداز میں خیریت معلوم کر کے مجھے اپنا تعارف کرانے کا حکم دیا، میں نے اپنا نام اور ”جامعۃ الملک سعود“ میں حال ہی میں داخلہ لینے کا ذکر کیا، ساتھیوں نے دارالعلوم دیوبند سے میری تدریسی وابستگی کا ذکر بھی کر دیا، جس سے وہ بے حد خوش ہوئے اور دارالعلوم دیوبند اور اس کے مشائخ و طلبہ کے حالات معلوم کیے اور فرمایا کہ: دارالعلوم دیوبند تو ایک ایسا دینی مرکز ہے جس نے ہزاروں علماء، مفکرین، مصنفین اور مجاہدین پیدا کیے، پھر دارالعلوم کے چند مخصوص ان اساتذہ کرام کے حالات معلوم کیے جن کو شیخ ذاتی طور پر جانتے تھے اور ہندوستان کے چند دیگر علماء کے حالات بھی دریافت کیے۔

شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ اچانک ملاقات احقر کے لیے باعثِ خوشی اور ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی، جس نے کتابوں کی نمائش میں جانے کا اصل مقصد بھلا دیا اور دل یہ چاہ رہا تھا کہ ان خوشگوار لمحات کا دورانیہ طویل ہو! لیکن نمازِ عشاء کا وقت قریب آ گیا اور ہم سب لوگ مسجد کی طرف روانہ ہو گئے اور مختصر وقت میں یہ پہلی اور دلچسپ ملاقات اگرچہ اپنے اختتام کو پہنچی، تاہم اس نے شیخ کی محبت و عقیدت میں

اضافہ کر دیا اور اس ارادے کو بھی مضبوط بنادیا کہ ریاض میں موجودگی کے دوران شیخ سے ان شاء اللہ تعالیٰ! استفادہ کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔

شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ کی ”جامعة الملك سعود“، منتقلی اور احقر کے لیے استفادہ کا ایک نادر موقع

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ شیخ ابو غدہؒ ”جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية ریاض“ کے استاذ تھے اور میرا داخلہ ”جامعة الملك سعود ریاض“ میں ہوا تھا، اور یہ دونوں الگ الگ مستقل علمی ادارے ہیں اور ریاض شہر کے اندر دونوں کا محل وقوع بھی جدا جدا ہے، اس لیے شیخ سے استفادہ کرنے میں دشواری تھی، کیونکہ نہ تو میرے پاس کوئی ذاتی سواری تھی اور نہ وقت میں اتنی گنجائش تھی کہ میں روزانہ ”جامعة الملك سعود“ کے اوقاتِ درس میں بھی حاضر رہوں اور پھر ”جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية“ جا کر شیخ کی خدمت میں بھی حاضری دیا کروں، لہذا اس پر غور کر رہا تھا کہ ہفتہ وار چھٹیوں (جمعرات اور جمعہ) اور اسی طرح دیگر چھٹیوں میں شیخ سے استفادہ کی کوئی ترتیب بناؤں گا۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ میرے داخلہ کو ابھی مختصر ہی عرصہ ہوا تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ شیخ عبدالفتاح ابو غدہؒ ”جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية“ سے ”جامعة الملك سعود“ منتقل ہو رہے ہیں، جہاں ”كلية التربية“ کے آخری سال کے طلبہ اور دراساتِ علیا کے طلبہ کو علومِ حدیث پڑھائیں گے، میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، اس لیے کہ اس صورت میں شیخ سے استفادہ کرنے کی

میری ایک دیرینہ خواہش پوری ہو جاتی۔

”جامعة الملك سعود“ میں میرا داخلہ شعبہ ”معهد اللغة العربية“ میں ہوا تھا اور شیخ شعبہ ”الثقافة الإسلامية، كلية التربية“ میں پڑھانے لگے، لہذا باضابطہ طور پر تو میرا کوئی سبق ان کے پاس نہیں تھا، لیکن حسن اتفاق سے ”معهد اللغة العربية“ میں میرے اسباق صبح کے وقت ہوتے تھے اور شیخ ”كلية التربية“ میں شام کے وقت علوم الحدیث پڑھاتے تھے، میں نے شیخ سے ان کے گھنٹے میں سامع کی حیثیت سے شرکت کی اجازت طلب کی، انہوں نے بڑی خوشی کے ساتھ درخواست منظور فرمائی، اسی طرح میں نے ان سے یہ درخواست بھی کی کہ ”كلية التربية“ میں واقع ان کے دفتر میں فارغ اور مناسب وقت میں استفادہ کے لیے مجھے حاضری کی اجازت مرحمت فرمائیں! انہوں نے یہ درخواست بھی منظور فرمائی، چنانچہ احقر کی ایک خوش قسمتی یہ رہی کہ شام کے وقت شیخ کے ایک گھنٹے میں سامع کی حیثیت سے شریک ہو جاتا اور دوسری خوش قسمتی یہ کہ ان کے دفتر میں ان کی اجازت سے مناسب وقت میں استفادہ کے لیے حاضر ہو جاتا، اور جب ان جامعہ کی مرکزی لائبریری میں مطالعہ کے لیے کبھی تشریف لے جاتے تو ایک خادم کی حیثیت سے بعض دفعہ احقر کو ان کے ساتھ لائبریری جانے کا موقع بھی مل جاتا، جہاں شیخ کے لیے مطلوبہ کتابوں کو تلاش کرنے کی سعادت مجھے نصیب ہوتی اور ان سے سیکھنے اور استفادہ کرنے کا خصوصی موقع مل جاتا، یہ سلسلہ تقریباً دو سال (۱۴۰۸ھ - ۱۴۰۹ھ) تک جاری رہا، اس دوران حضرت شیخ ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کو قریب سے دیکھنے اور ان کے علمی و عملی کمالات مشاہدہ کرنے کا موقع ملا، ان کی علمی

خصوصیتوں اور سیرت و کردار کی بلندیوں کا مفصل تذکرہ نہ تو میرے بس میں ہے اور نہ ہی اس مختصر مضمون میں ان تمام خوبیوں کو سمویا جاسکتا ہے، تاہم اپنے قلبِ حزیں کی تسکین اور قارئین کے فائدے کے لیے ان کے علمی و عملی کمالات کے چند نمونے سپردِ قلم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

علومِ دینیہ کے سچے متلاشی

حضرت علامہ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک ایک سچے طلبگارِ علم رہے، انہوں نے علمی ذخائر اور اہلِ علم کی تلاش میں اپنے ملک شام کے علاوہ حجاز، مصر، عراق، یمن، سوڈان، المغرب، ترکیہ، ہندوستان، پاکستان اور دیگر ممالک کے دورے کیے اور بڑے بڑے اہلِ علم و اصحابِ تحقیق سے صرف استفادہ نہیں کیا، بلکہ ان کے علوم و تحقیقات کو اپنے اندر جذب کر لیا اور وہاں کے بڑے بڑے کتب خانوں اور لائبریریوں سے خوب استفادہ کیا، اور پھر مسلسل کتبِ مبنی، تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے اور علم و تحقیق کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے باوجود ان کی علمی پیاس نے کبھی بجھنے کا نام نہیں لیا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی علمی پیاس میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا رہا تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ذیل میں ان کی زندگی کے مختلف واقعات میں سے صرف چار ایسے واقعات نمونے کے طور پر درج کیے جا رہے ہیں، جن سے طلبِ علم کے لیے ان کی محنت، علمی وسائل تلاش کرنے کے لیے ان کی قربانی اور اس راستے میں ان کی جفاکشی کا ایک اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

پہلا واقعہ

جب حضرت شیخ ابو غدّہ ”کلیۃ الشریعۃ جامع ازہر“ کے طالب علم تھے، اس زمانے میں ان کے محترم استاذ حضرت علامہ محمد زاہد کوثری حنفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۳۷۱ھ) نے ان کو ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”فتح باب العنایۃ بشرح کتاب النقایۃ“ پڑھنے اور اپنے پاس رکھنے کی تاکید فرمائی تھی، کتاب چونکہ نایاب ہو گئی تھی، اس لیے شیخ ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تلاش میں طویل محنت اور دعائیں کیں، بالآخر ایک نسخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اپنی منفرد تحقیق کے ساتھ اس کی پہلی جلد شائع کر دی، دوسری جلد کا کام جاری تھا کہ شیخ کا انتقال ہوا اور اب ان کے ہونہار صاحبزادے شیخ سلمان ابو غدّہ حفظہ اللہ اس کی تکمیل میں مصروف ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ شیخ عبدالفتاح ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحقیق کے مقدمہ میں مذکورہ ناپید کتاب تک پہنچنے کا جو عبرت انگیز واقعہ ذکر کیا ہے، اس کا ترجمہ و مفہوم پیش کیا جا رہا ہے:

”جب میں ”کلیۃ الشریعۃ - جامع ازہر“ کا طالب علم اور قاہرہ میں مقیم تھا تو ہمارے استاذ حضرت علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ سے قریبی وابستگی رہی، اس دوران انہوں نے ایک دفعہ مجھے تاکید فرمائی تھی کہ میں علامہ ملا علی قاری کی کتاب ”فتح باب العنایۃ بشرح کتاب النقایۃ“ کو تلاش کر کے اپنے پاس استفادہ کے لیے رکھوں، میرے استاذ کو چونکہ یہ معلوم تھا کہ میں نایاب اور مفید کتابوں کا دلدادہ ہوں، اس لیے مجھے مذکورہ کتاب تلاش کرنے کا حکم دیا، میرا خیال یہ تھا کہ مذکورہ کتاب ہندوستان کی چھپی ہوئی ہوگی، اور قاہرہ میں چھ سال قیام کے دوران برابر اس کو تلاش کرتا رہا اور اپنی تعلیم کی تکمیل تک جس

کتب خانہ میں بھی کچھ اندازہ ہو جاتا کہ شاید یہاں پر موجود ہو وہاں اُسے ڈھونڈتا رہا، لیکن اس کا کوئی اتنا پتا نہیں چل سکا۔

اور جب قاہرہ سے اپنے وطن حلب لوٹا تو جس شہر میں بھی جانا ہوتا یا جس کتب خانہ کی زیارت ہوتی میں برابر مذکورہ کتاب کو تلاش کرتا اور چونکہ مذکورہ کتاب کا تعلق فقہ حنفی سے تھا، اس لیے میرا خیال یہ تھا کہ ہندوستان کی چھپی ہوئی ہوگی اور کتاب فروشوں سے اس امید پر ہندوستان کی چھپی ہوئی فقہ حنفی کی عام کتابوں سے متعلق پوچھتا رہتا کہ ہو سکتا ہے اپنی مطلوبہ کتاب ان کے ضمن میں مل سکے، اس لیے کہ بعض مرتبہ کتاب فروشوں کو کتاب کا نام یاد نہیں رہتا، اور دمشق کے کتاب فروشوں میں سے کچھ پرانے حضرات ایسے بھی تھے جو پرانی اور عمدہ کتابوں سے متعلق کافی معلومات رکھتے تھے اور خود ان کے پاس بھی ایسی کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ موجود تھا، البتہ ان کو بیچنے میں سختی سے کام لیتے تھے اور کافی مہنگے داموں فروخت کرتے تھے، اُن حضرات میں سے سید عزت القُصُیاتی اور ان کے والد، اور شیخ حمدی السَّفرُ جَلَّانی اور سید احمد عبید بھی تھے۔

میں نے سید عزت القُصُیاتی سے ”فتح باب العنایة“ سے متعلق یہ کہہ کر دریافت کیا کہ ہندوستان کی چھپی ہوئی کتاب ہے، انہوں نے کہا کہ ہاں! میرے پاس موجود ہے اور مذکورہ کتاب کے بجائے علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”البنایة بشرح الهدایة“ جو چھ ضخیم جلدوں میں تقریباً سو سال پہلے ۱۲۹۳ھ کی چھپی ہوئی تھی نکال کر پیش کر دی۔ میں نے اس کتاب کا نام اگرچہ نہیں لیا تھا، تاہم یہ بھی ان نایاب اور عمدہ کتابوں میں سے ایک تھی جن کو میں تلاش کر رہا تھا، لہذا میں نے مناسب قیمت پر یہ کتاب ان سے خرید لی اور انہوں نے زیادہ قیمت اس لیے وصول نہیں کی کہ میں نے اس کتاب کا نام تو نہیں لیا تھا۔ پھر میں نے شیخ حمدی السَّفرُ جَلَّانی رحمۃ اللہ علیہ سے کتاب کے بارہ میں معلوم کیا تو

انہوں نے کہا کہ یہ روس کے ایک شہر قز ان کی چھپی ہوئی ہے اور کبریتِ احمر سے زیادہ ناپید ہے، اور اپنی پوری زندگی اور کتابوں کے مشغلہ سے وابستہ ہونے کے دور میں صرف ایک نسخہ میرے ہاتھ آیا تھا جو میں نے علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کو اتنے اونچے داموں بیچا کہ تصور سے بالاتر ہے، ان کی اس بات سے یہ تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ کس شہر کی چھپی ہوئی کتاب ہے، البتہ ساتھ ساتھ اس کے دستیاب ہونے کی امید بھی کمزور ہو گئی۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے مجھے ۱۳۷۶ھ کو پہلی بار اپنے بیتِ کریم کے حج کا موقع نصیب فرمایا اور میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تو اس امید پر وہاں کے کتب خانوں میں مذکورہ کتاب کو تلاش کرتا رہا کہ شاید روس سے بلد اللہ الحرام کی طرف ہجرت کرنے والوں کے ساتھ یہ کتاب بھی پہنچ گئی ہو، لیکن مجھے کامیابی نہ مل سکی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی عنایت نے مکہ مکرمہ کے چند معمولی بازاروں میں سے ایک بازار کے اندر ایک گوشہ نشین بزرگ کتب فروش تک مجھے پہنچایا جن کا نام تھا شیخ مصطفیٰ بن محمد شنتقی سلمہ اللہ تعالیٰ، میں نے ان سے کچھ کتابیں خرید لیں اور ناامیدی کی کیفیت میں میری مطلوبہ کتاب کے بارہ میں بھی ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ: تقریباً ایک ہفتہ پہلے میرے پاس اس کا ایک نسخہ آیا تھا جو میں نے علماء بخارا میں سے ایک شخص کے ترکہ سے خریدا تھا اور پھر تاشقند کے ایک عالم کو اچھی خاصی قیمت پر بیچ دیا، مجھے پورا یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ میری مطلوبہ کتاب ہوگی، لیکن جب انہوں نے کتاب کی پوری کیفیت بیان کی تو معلوم ہوا کہ یہ تو وہی کتاب ہے جس کے حصول کے لیے میں چکر پر چکر کاٹا رہا ہوں اور عرصہ سے اس کی تلاش میں ہوں۔

میں نے ان سے کہا کہ وہ تاشقندی عالم کون تھے جنہوں نے کتاب خریدی؟ وہ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد بتانے لگے کہ ان کا نام شیخ عنایت اللہ تاشقندی تھا،

میں نے کہا کہ ان کی رہائش گاہ یا کام کرنے کی جگہ کہاں ہے؟ کہنے لگے: مجھے مزید کچھ بھی پتہ نہیں، میں نے کہا کہ میں انہیں کیسے تلاش کروں گا؟ انہوں نے کہا کہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ اس صورتحال سے کتاب یا اس کے خریدار ملنے کی ناامیدی میں اضافہ ہوا، لیکن پھر بھی میں جس بخاری شخص کو مسجد حرام یا مکہ کے بازاروں میں دیکھتا اس سے شیخ عنایت اللہ کا پوچھتا، اور جن مدارس یا رابطات سے متعلق مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں بخاری حضرات قیام پذیر ہیں وہاں جا کر مذکورہ بخاری شیخ کو تلاش کرتا، یہاں تک کہ مکہ سے باہر جو محلے واقع تھے اور مجھے معلوم ہوتا کہ وہاں پر بخاری حضرات رہتے ہیں، وہاں بھی جا کر پوچھتا، لیکن مطلوبہ شخص کا ملنا دشوار تر ہو گیا، اگرچہ مکہ مکرمہ میں عنایت اللہ نام کے بہت سارے دوسرے حضرات رہتے تھے۔

میری مسلسل تلاش نے آخر میں مجھے شیخ عبدالقادر تاشقندی بخاری ساعاتی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچایا جو مکہ کے کنارے میں واقع محلہ جزول میں قیام پذیر تھے، میں نے ان سے مطلوبہ تاشقندی شیخ کے بارہ میں معلوم کیا تو انہوں نے ان کو پہچانا اور ان کا صحیح نام ”شیخ میر عنایت تاشقندی“ بتایا، لیکن ان کی قیام گاہ یا ملنے کی جگہ سے چونکہ وہ لاعلم تھے اس لیے مجھ پر ایک مایوسی کی کیفیت چھا گئی اور جس شیخ کے پاس سے ”فتح باب العنایة“ ملنے کی توقع کی جا رہی تھی، ان سے ملاقات کی امید بظاہر دم توڑ گئی! اس کے بعد میں نے کعبہ معظمہ زادہ اللہ تشریفاً و تعظیماً کے ارد گرد طواف کے دوران اللہ تعالیٰ سے یہ مانگنا شروع کیا کہ مجھے اس مطلوبہ شخص سے ملا دیں اور میرے لیے اس کتاب کا حصول آسان فرمادیں، اور دعا مانگنے کا یہ سلسلہ ایک ہفتہ تک برابر جاری رکھا اور اللہ جانتا ہے کہ میرا یہ ہفتہ اس کیفیت میں گزرا کہ میرا دل مذکورہ کتاب اور اس کے مالک کی تلاش میں پریشان تھا۔

مذکورہ کیفیت کے ساتھ میں ایک دن بازار ”باب زیادة“ میں چل رہا تھا (باب زیادة مسجد حرام کی توسیع سے پہلے اس کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کا نام تھا) اس دوران مکہ مکرمہ کے ایک پرانے دمشق تاجر نے مجھے دیکھا جن کو ابو عرب کہا جاتا تھا اور مکہ مکرمہ میں ان کی تجارت گاہ تھی، انہوں نے مجھے شامی ہیئت و لباس میں دیکھ کر اپنے یہاں بلایا اور شام اور شام والوں کے احوال معلوم کرنے لگے، میں نے اپنی مطلوبہ کتاب سے شدتِ محبت کے تحت ان سے مذکورہ بخاری شیخ کے بارہ میں پوچھا، حالانکہ یہ تو خود دمشق تاجر تھے! انہوں نے کہا کہ سامنے والی دکان ان کے داماد کی ہے اور وہ سب سے زیادہ ان سے واقف ہیں، اللہ کی قسم! میں زیادہ خوشی کی وجہ سے ان کی تصدیق نہیں کر پا رہا تھا۔

بہر صورت! میں ان کے داماد کے پاس گیا اور ان سے شیخ عنایت کا پوچھا، وہ حیران ہو کر کہنے لگے کہ: ان کو تلاش کرنے اور ان سے ملنے کی آپ کو کیا ضرورت پیش آگئی؟ میں نے کہا کہ مکہ مکرمہ میں میرا ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا کہ میں ان کو برابر ڈھونڈ رہا ہوں، اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائیں، آپ اس سلسلہ میں میری راہنمائی کیجئے، انہوں نے ”حی المسفلة“ میں واقع ان کی رہائش گاہ کی پوری نشاندہی کر دی جو کہ ”قهوة السقيفة“ کے بغل میں واقع تھی، میں بار بار دن رات ان کے گھر جاتا رہا، یہاں تک کہ ان سے ملاقات ہو گئی اور وہ اپنی من پسند قیمت پر کتاب دینے کے لیے آمادہ ہو گئے، پس یہ میری زندگی کی خوشیوں میں سے ایک اہم خوشی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب کی جلد اول کی تحقیق و اشاعت کی توفیق عطا فرمادی، اور اللہ تعالیٰ سے درخواست ہے کہ اپنے فضل و کرم سے باقی حصہ کی اشاعت کی توفیق بھی عنایت فرمادیں۔“

(مقدمہ تحقیق فتح باب العنایۃ، ص: ۸-۹۔ صفحات من صبر العلماء، ص: ۲۷۹-۲۸۱)

دوسرا واقعہ

علامہ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۳۵۲ھ) کی کتاب ”التصریح بما تو اتر فی نزول المسیح“ کی تلاش تھی! کتاب چونکہ نایاب ہو گئی تھی، شیخ نے اس کی تلاش پندرہ سال سے زیادہ عرصہ تک جاری رکھی، آخر میں ایک نسخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر اپنی منفرد تحقیق کے ساتھ اس کو شائع کر دیا۔ شیخ نے تحقیق کے مقدمہ میں مذکورہ کتاب کو

تلاش کرنے کا جو واقعہ لکھا ہے، اس کا مفہوم اردو زبان میں پیش کیا جا رہا ہے:

”جو کتاب میں نذرِ قارئین کر رہا ہوں وہ میری زندگی کی قیمتی تمنا تھی، لیکن اس کا حصول میرے لیے کافی مشکل ہو گیا تھا، اس کا صرف ایک نسخہ حاصل کرنے کے لیے میں نے پندرہ سال سے زیادہ عرصہ تک تلاش جاری رکھی، لیکن پھر بھی کامیابی نہ مل سکی، کتابوں کے شہر ”مصر“ میں چھ سالہ قیام کے دوران وہاں کے کتب خانوں میں برابر اس کو ڈھونڈتا رہا، اس کے بعد مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے کتب خانوں میں اس کی تلاش جاری رکھی، لیکن پھر بھی نہ مل سکی، پھر ہندوستان و پاکستان کے بعض بڑے اہل علم سے درخواست کی کہ یہ کتاب چونکہ ہندوستان کی چھپی ہوئی ہے، اس لیے آپ حضرات اس کا ایک نسخہ تلاش فرمائیں! میں اس بات پر تو ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کتاب کو تلاش کرنے کی کافی کوشش کی، البتہ وہ پھر بھی دستیاب نہ ہو سکی، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد اور پھر ایک جلیل القدر شخصیت کی تالیف تھی، اس لیے جیسے ہی ۱۳۴۴ھ کو پہلی بار دہلی میں شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ ختم ہو گئی اور بعد میں اس کا ایک نسخہ بھی ملنا مشکل ہو گیا۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے مجھے ہندوستان و پاکستان کے سفر کا موقع عنایت فرمایا اور

وہاں کے کتب خانوں کی زیارت نصیب ہوئی تو میں نے وہاں پر بھی اس کی بڑی تلاش کی، لیکن کامیابی نہیں ملی، البتہ جب میں ہندوستان و پاکستان کے اس سفر کی آخری فرودگاہ کراچی پہنچا اور ہمارے جلیل القدر استاذ، محقق کامل، مفتی اعظم علامہ محمد شفیع صاحب بانی دارالعلوم کراچی کی زیارت کا موقع ملا تو میرے اوپر ان کے احسانات میں سے ایک خصوصی احسان یہ رہا کہ انہوں نے اس کتاب کا اپنا مخصوص نسخہ ایک معزز و نایاب ہدیہ کے طور پر مجھے عنایت فرمایا، یہ علمی ہدیہ میری واپسی سے صرف ایک دن قبل بروز ہفتہ ۷ / جمادی الاولیٰ ۱۳۸۲ھ کو انہوں نے اس امید کے ساتھ مجھے عنایت فرمایا کہ یہ کتاب بلادِ عرب میں شائع ہو جائے، میں نے ان کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے اور اس ہدیہ کی تعریف و قدر دانی کرتے ہوئے اسے قبول کیا، البتہ اتنی فرصت نہیں تھی کہ میں اس کی ورق گردانی کروں، اس لیے کہ اگلے دن بروز اتوار ۸ / جمادی الاولیٰ کو صبح سویرے مجھے سفر کرنا تھا اور تیاری میں لگا ہوا تھا، لہذا یہ ارادہ کیا کہ ”سوریہ“ جاتے ہوئے ہوائی جہاز کے اندر اس کو رفیق سفر بناؤں گا۔

صبح جب میں اپنے ملک واپسی کے لیے کراچی ایئرپورٹ پہنچا تو وہاں پر اہل علم و فضل کی ایک جماعت کو موجود پایا جو اس عاجز و ناتواں کو اکرام کے ساتھ رخصت کرنے اور اس کو اپنی آخری اور قیمتی ملاقات سے نوازنے کے لیے جمع تھی، جہاز اڑنے کے مقررہ وقت سے کچھ پہلے اعلان ہوا کہ جہاز دو گھنٹے لیٹ ہے تو میں نے ان علمائے کرام سے درخواست کی کہ آپ حضرات اپنی مصروفیات کی انجام دہی کے لیے واپس تشریف لے جائیں، لیکن انہوں نے احقر کو رخصت کرنے اور مزید عنایت سے نوازنے کے لیے آخری لمحہ تک انتظار کرنے پر اصرار فرمایا، چونکہ یہ مہلت کا ایک بہترین موقع تھا، اس لیے ہم ایئرپورٹ کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے، اور چونکہ ان علمائے کرام کے ساتھ ان کے شاگردوں اور مخلصین کا بھی

ایک جم غفیر موجود تھا، اس لیے ہماری اس الوداعی ملاقات نے ایک بڑی علمی مجلس کی صورت اختیار کر لی، جس میں چیدہ چیدہ علمائے کرام شریک تھے، ان علمائے کرام میں سرفہرست ہمارے جلیل القدر استاذ مولانا علامہ محمد شفیع صاحب اور ہمارے بے مثال و کرم فرما استاذ مولانا علامہ محمد یوسف بنوری صاحب بانی مدرسہ اسلامیہ کراچی اور اسی مدرسہ کے جلیل القدر مدرس مولانا علامہ لطف اللہ صاحب اور مدرسہ دارالعلوم کراچی کے ناظم مولانا علامہ نور احمد صاحب اور دیگر اہل علم تھے، جن کے نام مجھے یاد نہیں رہے۔

میں نے چاہا کہ بہتر یہ ہوگا کہ فرصت کے ان لمحات کو قیمتی بنا کر ماہِ تابِ علم و کمال حضرات سے استفادہ کرنے میں خرچ کیا جائے، اس مقصد کے تحت میں نے مذکورہ کتاب ”التصريح بماتوا اترف في نزول المسيح“ نکال کر ان علمائے کرام سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اس کے ایک حصہ کی عبارت آپ کے سامنے پڑھنا چاہتا ہوں! انہوں نے میری اس خواہش کو سراہا، پھر میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ مجھے عبارت پڑھنے سے پہلے اس کتاب کی اجازت مرحمت فرمائیں! انہوں نے خوشی کے ساتھ اجازت مرحمت فرمادی۔ میں نے حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کا پورا مقدمہ اور کتاب کی تین حدیثیں پڑھیں، پھر ہمارے استاذ مجمع الفضائل والعلوم حضرت علامہ محمد یوسف بنوری حفظہ اللہ تعالیٰ نے مزید پانچ حدیثیں پڑھیں اور اس دوران علمائے کرام کے درمیان علمی نکات پر تبادلہ خیال بھی کیا جاتا رہا۔

جب میری روانگی کا وقت قریب ہوا تو میں نے اس وقت وہ دو شعر سنا دیئے جو دولت عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام اور ہمارے استاذ شیخ مصطفیٰ صبری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے مصر سے اپنے ملک واپسی کے لیے رخصت کرتے وقت سنائے تھے:

قالت ومدت يدانحوي تُودّعني ولوعةُ البين تَأبى أن تمدَّ يداً
أَمِيتَ أَنْتَ أَمْ حَيٌّ؟ فقلتُ لا من لم يمْتَ يومَ بَيْنٍ لم يمْتَ أبداً

ترجمہ و مفہوم

”اس نے رخصت لینے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھا دیئے، لیکن جدائی کا غم مجھے ہاتھ بڑھانے سے منع کر رہا تھا، کہنے لگی کہ: کیا تو مردہ ہے یا زندہ؟ میں نے جواب میں کہا کہ: جو جدائی کے دن بھی نہیں مرا، وہ پھر کبھی نہیں مرتا۔“

اس پر ہمارے استاذ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب نے مندرجہ ذیل دو شعر سنائے (جن میں فراق کے زمانہ میں ایام وصال کو یاد کرنے اور ان پر غمگین ہو کر رونے اور رُلانے کا تذکرہ ہے)

تَذَكَّرْ عَهْدًا بِالْحِمَىٰ ثُمَّ مَعَهْدًا جَرَىٰ فِيهِ مِنْ دَوْرِ الْكَؤُوسِ تَسْلُسُلْ
بَكَيْنًا فَأَبْكَيْنَا وَلَا مِثْلَ نَاقِفٍ لِحَنْظَلَةٍ فِي الْحَيِّ حِينَ تَحْمَلُوا
اس دوران حضرت بنوریؒ اور میری حالت (رونے کی کیفیت میں) مندرجہ ذیل شعر کے مطابق رہی:

وَيَبْكِي فَأَبْكِي رَحْمَةً لِّبَكَائِهِ إِذَا مَا بَكَى دَمْعًا بِكَيْتُ لَهُ دَمًا

ترجمہ و مفہوم

”وہ رورہا ہے تو میں بھی اس کے رونے پر رحم کھاتے ہوئے روتا ہوں، جب وہ آنسو بہاتا ہے تو میں اس کے لیے خون کا آنسو بہانے لگتا ہوں۔“

اس کے بعد رخصت اور جدائی کا وقت آیا اور میرے دل میں یہ پکا ارادہ تھا کہ اپنے شیخ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کی اس تمنا پر لبیک کہوں گا کہ یہ عظیم کتاب شائع ہونی چاہیے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و مدد سے سالِ رواں ۱۳۸۵ھ کو مذکورہ کتاب کی تحقیق و خدمت کا ایسا موقع عنایت فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ اس سے اہل علم کی

آنکھیں ٹھنڈی اور ایمان والوں کے قلوب منور ہوں گے، اور درست عقیدہ والوں اور سچے مسلمانوں کے اذہان بصیرت حاصل کریں گے، اور یہ بھی امید ہے کہ میں نے اس کتاب میں جو محنت و صبر و باریک بینی سے کام لیا ہے، وہ اس اللہ کے یہاں میرے لیے ذخیرہ آخرت ہوگا جو احسانات بکھیرنے والا اور عطا یا بخشنے والا ہے، اور جو پڑھنے والے اس کتاب میں کوئی فائدہ محسوس فرمائیں گے ان سے امید کرتا ہوں کہ مجھے ایسی نیک دعا میں یاد فرمائیں جس پر فرشتے آمین کہیں اور دعا کرنے والے کو بھی برابر کا ثواب ملے۔“

(مقدمہ تحقیق ”التصریح بما تواتر فی نزول المسیح“، ص ۳-۵)

تیسرا واقعہ

حضرت شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۳۸۲ھ کو جب علمائے کرام اور دینی مراکز کی زیارت کے لیے ہندوستان و پاکستان کا دورہ کیا، اس دوران جامعہ اشرفیہ لاہور بھی تشریف لے گئے، اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور دیگر علمائے کرام سے ملاقاتیں کیں، ان ملاقاتوں کے دوران شیخ نے جو علمی فوائد حاصل کر لیے ان میں سے نمونہ کے طور پر صرف ایک مختصر علمی نکتہ جو انہوں نے حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا آگے قلمبند کیا جا رہا ہے، تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ شیخ علمی فوائد کے کتنے دلدادہ اور قدردان تھے! اُس علمی نکتہ کا تذکرہ خود شیخ کی زبانی سنئے:

”حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے اس ملاقات کے دوران یہ بتایا کہ انہوں نے اپنے استاذ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ

انہوں نے اپنے استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر المدین دارالعلوم دیوبند سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شہادت فی سبیل اللہ کی آرزو پر گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی تمنائے شہادت تو کبھی پوری نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ”سیف اللہ“ کے لقب سے نوازا تھا اور اللہ کی تلوار کو نہ کوئی توڑ سکتا ہے اور نہ ہی سیف اللہ کو کوئی قتل کر سکتا ہے، لہذا ان کی شہادت کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ میں نے اپنے استاذ حضرت مولانا ادریس کاندھلوی حفظہ اللہ سے عرض کیا کہ میرے سفر کی قیمت اس ایک علمی نکتہ کے ذریعہ وصول ہو گئی، اس لیے کہ صرف یہی ایک علمی نکتہ ایک مستقل سفر کا حق دار ہے۔“

(حاشیۃ التصريح بما تواتر فی نزول المسیح، ص: ۲۱۲)

چوتھا واقعہ

حضرت شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مایہ ناز کتاب ”صفحات من صبر العلماء“ میں زمانہ طالب علمی کا اپنا ایک واقعہ لکھا ہے، جس سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ وہ ابتداء ہی سے طلب علم کی خاطر کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے، واقعہ کا اُردو ترجمہ و مفہوم پیش کیا جا رہا ہے:

”میں بھی عام طلبہ کی طرح طالب علمی کے زمانہ میں تنگدستی کا شکار رہا، تاہم اپنے معمولی خرچہ میں سے کچھ نہ کچھ بچا کر حسب استطاعت نقد یا ادھار پر کتابیں خرید لیتا، ایک دن کچھ ایسی نایاب و اہم کتابیں میرے سامنے فروخت کے لیے پیش ہوئیں جنہیں میں اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا، لیکن زیادہ تنگدستی کی وجہ سے خریدنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا! جس کی وجہ سے میں تشویش میں مبتلا ہو گیا، پھر میں نے اُون کی بنی ہوئی اپنی ایک خوبصورت چادر جو مجھے اپنے

والد سے وراثت میں ملی تھی ”سوق الحراج“ (ایک بازار کا نام ہے) میں بیچ کر مذکورہ کتابیں خرید لیں اور اپنے دل کو مطمئن کر دیا، ان کتابوں کے خریدنے اور اپنے پاس رکھنے سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ الحمد للہ! وہ قیمتی چادر پھر یاد بھی نہیں رہی۔“ (صَفَحَات من صبر العلماء، ص: ۲۷۸-۲۷۹)

احقر کہتا ہے کہ مذکورہ چار واقعات شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی زندگی کے بے شمار حیرت انگیز واقعات میں سے چند ہی ہیں، جو نمونہ کے طور پر پیش کیے گئے ہیں اور جن سے شیخ کے جذبات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے اور ان کے ایسے ہی واقعات و جذبات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مشہور مقولہ کو صرف پڑھا ہی نہیں تھا، بلکہ عملی میدان میں اس کا پورا حق ادا کر دیا تھا: ”العلم لا يُعطيك بعضه حتى تعطيه كلك“ (علم اپنا ایک حصہ بھی اس وقت تک آپ کو نہیں دیتا جب تک آپ اپنا سب کچھ اس کو نہیں دیتے) اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایسے ہی جذبات کی بدولت شیخ نے ”صَفَحَات من صبر العلماء علی شدائد العلم والتحصيل“ اور ”قیمۃ الزمن عند العلماء“ جیسی مقبول ترین کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور اس کے علماء و مشائخ سے بے پناہ محبت و

عقیدت

شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کو علمائے ہند سے بالعموم اور مشائخ دارالعلوم دیوبند سے بالخصوص بے پناہ محبت و عقیدت تھی، اسی عقیدت کے تحت انہوں نے ۱۳۸۲ھ کو ہندوستان و پاکستان کا ایک طویل سفر کیا جس کا مقصد علمائے کرام سے

ملاقاتیں، دینی مراکز کی زیارت اور وہاں کے کتب خانوں اور لائبریریوں سے استفادہ کرنا تھا، مذکورہ طویل سفر کے دوران شیخ نے ”فرنگی محل لکھنؤ“ میں حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۰۴ھ) کے خاندان کے علماء سے ملاقات کی اور حضرت مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و تالیفات سے متعلق ان سے دقیق معلومات حاصل کیں، اسی طرح حضرت علامہ ابوالوفاء افغانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۳۹۵ھ) رئیس ”مجلس احیاء معارفِ نعمانیہ حیدرآباد دکن“ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ان سے علمی استفادہ کیا، شیخ نے خود ”الرفع والتکمیل فی الجرح والتعديل“ کی تحقیق کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ میں نے اس سفر میں تیس ایسے شہروں کی زیارت کی جہاں بڑے اہل علم و کمال اور دینی مراکز موجود تھے۔

شیخ ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں ان تیس شہروں میں سے سب سے اہم اور سرفہرست شہر دیوبند اور اس کا دینی مرکز دارالعلوم دیوبند تھا، چنانچہ وہ خصوصی طور پر دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے مشائخ کی زیارت کے لیے دیوبند تشریف لے گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے نظم و نسق اور علمی و اصلاحی ماحول کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے اور اس وقت کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک سبق میں شرکت بھی فرمائی۔ اس موقع پر شیخ نے دارالعلوم کے رجسٹر میں اپنے جن تاثرات کو قلمبند کیا ہے ان میں اس بات کو خاص طور پر اہمیت دی ہے کہ علمائے دیوبند کی اکثر تالیفات جو علوم و معارف کے خزانے ہیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں اور عالم عرب ان کے استفادہ سے محروم ہے، لہذا میری پرزور گزارش و درخواست ہے کہ ان کو عربی زبان میں منتقل کر دیا جائے۔ حضرت شیخ ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ

کے تاثرات کا اردو ترجمہ تاریخ دارالعلوم دیوبند سے نقل کیا جا رہا ہے:

”اس عاجز و ناتواں راقم سطور کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا فضل و انعام ہے کہ اس نے ہندوستان کے شہروں کی سیاحت و زیارت کا موقع بہم پہنچایا، بالخصوص ان شہروں میں سرفہرست دیوبند اور اس کی دینی درسگاہ ”دارالعلوم“ کا درجہ ہے، جو درحقیقت ہندوستان کا علم و تقویٰ سے بھرپور زندہ قلب، علماء و مؤلفین کا مرکز اور دین و معرفت کے طلبہ کی آماجگاہ ہے، اس مرکز کی زیارت عمر بھر کی تمناؤں اور لیل و نہار کے خوابوں میں سے ایک خواب و تمنا تھی، خدا کا شکر ہے کہ آج دارالعلوم کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور پرانا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔

دور رہتے ہوئے جو کچھ دارالعلوم کے بارے میں سنا تھا، اس کا جو کچھ ذہن میں خاکہ و تصور تھا قریب سے دیکھ کر اس کو اس سے کہیں زیادہ اچھا اور بہتر پایا، اس مقدس ادارے کے گوشے گوشے سے انوارِ علم کا فیضان ہوتا ہے، اس کی درسگاہوں میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی تعلیم دی جاتی ہے اور تشنہ کارانِ علم اور طالبانِ رشد و ہدایت کے لیے مثالی نظم و نسق، سلیقہ شعاری اور روشن دماغی کے ساتھ اس اسلوب سے احکام دین و شریعت بیان کیے جاتے ہیں، جس میں اہل روحانیت کی روحانیت، اور اصحابِ علم و تحقیق کے آثار و فیوض نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ کمالِ فضل و احسان ہے کہ مجھے مولانا الأجل بركة الأمة ذو الأنفاس الطاهرة سیدی الشیخ المحدث السید فخرالدین أحمد المراد آبادی کے درسِ حدیث شریف کے کچھ حصہ کی سماعت کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت موصوف نے طلبہِ محبینِ کرام کی درخواست پر احقر کی رعایت کرتے ہوئے حدیث بنی سلمہ پر عربی میں تقریر فرمائی، جس میں ذکر ہے کہ بنی

سلمہ کی خواہش ہوئی کہ وہ اپنے مکانوں کو چھوڑ کر مسجد نبوی کے جوار میں منتقل ہو جائیں، رسول اللہ ﷺ کو ان کے اس ارادے کا علم ہوا تو ارشاد فرمایا: ”دیارکم تُکتب لکم آثارکم۔“

موصوف کی تقریر بیش بہا موتیوں اور تابناک ستاروں کا مجموعہ اور ”فیض الباری“ اور ”عمدة القاری“ کا مصداق تھی، اسی کے ساتھ شیخ موصوف کی طرف سے ان طلبہ کو جو گوش برآواز تھے اپنے خصوصی ارشادات سے نوازنے کا سلسلہ جاری تھا جو ان تلامذہ کے نفوس میں اس طرح سرایت کرتے تھے جس طرح عطر ہوا میں اور پانی زندگی میں کرتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کو سنتِ مطہرہ اور اس کے قبعین کی طرف سے جزائے خیر دے اور اس ادارے کو ساتھ الشیخ صدر المدرسین مولانا العلّامة ابراہیم البلیاوی اور مولانا القاری محمد طیب صاحب جیسے ارکان و اساطین، ائمہ اجلہ، بدور الہدیٰ (بدرہائے ہدایت) اور مصابیح دُجی (شمعہائے ظلمت) کے زیر سایہ ہمیشہ پھلتا پھولتا قائم رکھے اور ان بزرگوں کے نفع بخش اوقات اور انفاسِ طاہرہ میں برکت عطا فرمائے۔

ذمہ دارانِ مدرسہ نے میرے ساتھ مزید احسان و اکرام یہ کیا کہ احقر کو اپنا خصوصی مہمان بنایا، اس طرح بسہولت علمائے کرام سے علمی استفادے کا موقع ملا، فلّٰہ الحمد، نیز وہ چیز جس کے لیے آج ہم سب اللہ تعالیٰ کے مرہونِ منت اور احسان مند ہیں، وہ یہ ادارہ ہے جو مع اساتذہ و تلامذہ کے دین کا گھنا سایہ دار درخت، علم و تقویٰ کا مرکز اور جسمِ اسلامی کی بقاء کا ضامن وہ پھیپھڑا ہے جس میں حیاتِ روحانی کے آثار رواں دواں ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اس ادارے کی بقا و ترقی اور اس کے علماء کے طولِ حیات سے زیادہ سے زیادہ مستفیض فرمائے، واللّٰہ یجیب ولا یشیّ ربّاء الرّاجین فضلاً منہ وکرمًا۔

علم و تقویٰ کے اساطین سے مالا مال اس عظیم الشان ادارے کے علماء عظام کی خدماتِ جلیلہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں، بلکہ اگر ذرا جرأت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارا ایک واجبی حق ہے، جس کا مطالبہ کر رہا ہوں، وہ یہ کہ ان علمائے کرام کا فریضہ ہے کہ اپنے متفردانہ عقول کے نتائجِ فکر اور بیش بہا علمی فیوض و تحقیقات کو عربی زبان کا جامہ پہنا کر عالم اسلام کے دوسرے علماء کے لیے استفادے کا موقع فراہم کریں، یہ فریضہ ان حضرات پر اس لیے عائد ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص ہندوستان کے علمائے محققین کی کوئی تصنیف پڑھتا ہے تو اُس میں اُس کو وہ نئی متفردانہ تحقیقات ملتی ہیں جن کا مدار علیہ گہرے علم اور وسیع مطالعہ کے علاوہ تقویٰ و صلاح اور روحانیت ہوتی ہے، اور چونکہ ہندوستان کے علماء و شیوخ کرام نیکی و صلاح اور روحانیت اور استغراق فی العلم جیسی شرائط پر نہ صرف یہ کہ پورے اُترتے ہیں، بلکہ سلف صالحین کے صحیح وارث اور ان کے نمونے ہیں، اس لیے ان کی کتابیں نئی اور کارآمد چیزوں سے خالی نہیں ہوتیں، وذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء، بلکہ ان حضرات کی بعض کتابیں تو وہ ہیں جن میں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو متقدمین علمائے اکابر، مفسرین و محدثین اور حکماء کے ہاں بھی دستیاب نہیں ہوتیں، لیکن افسوس اور قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان نادر تالیفات میں سے اکثر بلکہ سب کی سب اردو زبان میں لکھی گئی ہیں، جو گو ہندوستان کی عام اسلامی زبان سہی، لیکن عربی کو کثیر الاستعمال اور علوم اسلام کی خاص زبان ہونے کا جو شرف حاصل ہے، ظاہر ہے کہ وہ اردو کو حاصل نہیں، لہذا یہ علوم اور بیش قیمت تحقیقات جو ہمارے برادرانِ اسلام علمائے ہند کا خصوصی حصہ اور کارنامہ ہیں اگر اردو ہی کے قالب میں مجبوس رکھی گئیں تو ہم عربی زبان بولنے والوں سے مخفی اور پوشیدہ رہ کر ہماری محرومی کا باعث بنی رہیں گی۔ اس طرح نہ صرف ہمارے ساتھ نا انصافی ہوگی

بلکہ علم و دین کے حق کا بھی ایک بہت بڑا نقصان ہوگا، اس لیے فریضہ معرفت اور امانتِ علم کی ادائیگی کے لیے یہ بات اولین واجبات میں سے ہے کہ ان نفیس، شاہکار اور عمدہ کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے، تاکہ ان سے وہ آنکھیں روشنی حاصل کریں جو ایسی چیزوں کے لیے بے تاب، تشنہ اور مشتاق ہیں اور جیسا کہ میرا خیال ہے اس اہم ذمہ داری اور کٹھن فریضہ کی ادائیگی کا کام اسی ادارہ عامرہ کے افراد کر سکتے ہیں جو علمائے کرام اور طلبہٴ نجباء کا گہوارہ و سرچشمہ ہے۔

اس موقع پر جبکہ میں ذمہ دارانِ ادارہ کے مشفقانہ طرزِ عمل، نوازشاتِ بزرگانہ اور طلبہٴ عزیز کے جذباتِ محبت و اخوت کے لیے کلماتِ شکرِ حیطہ تحریر میں لا رہا ہوں اپنے مذکورہ بالا حق اور مطالبے کو دہرانے کی ایک بار پھر پُر امید ہو کر جرأت کرنا ضروری سمجھتا ہوں، اس لیے کہ اگر ان حضرات نے اس فریضہ کی ادائیگی کی طرف توجہ مبذول فرمائی تو اس طرح جہاں وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوں گے، ساتھ ہی ساتھ یہ دین و ثقافت کی ایک عظیم الشان خدمت اور قابلِ ذکر کارنامہ ہوگا، کیونکہ یہ علوم دنیا کے تمام مسلمانوں ہی کی ملک نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان مساوی طور پر اس سے استفادے کے مستحق ہیں، چہ جائیکہ صرف ہندوستان ہی کے مسلمان ان کے اجارہ دار قرار پائیں، اس لیے از بس ضروری ہے کہ اُردو کتابوں کے عربی میں تراجم کیے جائیں، تاکہ ان کی زیادہ سے زیادہ ترویج و اشاعت ہو، اور وسیع پیمانے پر ان سے استفادے کے مواقع فراہم کیے جاسکیں۔

مجھے یہ سن کر کسی حد تک اطمینان اور مسرت ہوئی کہ یہ اہم مسئلہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے زیرِ غور ہے، اور وہ عن قریب اس اہم بار اور ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے قدم اٹھانے والی ہے، جو درحقیقت اس ادارے کے علماء کا اور بالخصوص طلبہ کا واجبِ فرض ہے، میں اس خوشخبری کے بعد تمام علمائے اکابر کا ان

کے اس مبارک عزم اور اقدام پر تہ دل سے شکر یہ ادا کرتا ہوں، اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کارِ عظیم میں اس کی خصوصی مدد و معاونت ان کے شامل حال ہو، تاکہ بسہولت وہ اس فریضے کو مرحلہ تکمیل تک پہنچا سکیں، باری تعالیٰ کے لیے یہ کوئی دشوار امر نہیں، وَمَا ذَلِكْ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ اور نہ ہی ان علمائے امجد کے لیے ان کے پختہ عزائم کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی ایسا کٹھن اور دشوار گزار مرحلہ ہے جو ناقابلِ عبور ہو۔“

(تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اول، ص: ۳۷۴-۳۷۸)

شیخ ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ بالا تاثرات کا اظہار دارالعلوم دیوبند کی پہلی زیارت کے موقع پر کیا ہے، اس کے بعد بھی وہ کئی بار دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے ہیں اور وہاں کے ماحول میں آج تک ان کو بلند القاب و احترام کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔

خوش اخلاقی و خاکساری میں یکتا

شیخ ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ خوش اخلاقی و خاکساری کے ایک بلند مقام پر فائز تھے۔ جس وقت احقر کو ان کی زیارت اور ان کی درس گاہ میں سامع کی حیثیت سے حاضری کا شرف میسر رہا، اس وقت شیخ کی عمر ستر سال سے کچھ اوپر ہو چکی تھی اور ان کے علوم و تصانیف کی شہرت عالم اسلام کے گوشے گوشے تک پھیل چکی تھی، لیکن اس کے باوجود ان کی کسی ادا سے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی عجب یا خود پسندی میں مبتلا ہیں، بلکہ ان کی گفتار و کردار سے واضح طور پر یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک ادنیٰ طالب علم تصور

کرتے ہیں، چنانچہ میں دیکھتا تھا کہ درس گاہ میں پڑھاتے وقت جب کوئی طالب علم ان سے سوال کرتا تو وہ اپنی کرسی سے اُٹھ کر طالب علم کے قریب آ کر بہت ہی اہتمام و شفقت کے انداز میں اُسے سمجھا دیتے، اسی طرح میں نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہے کہ بعض مرتبہ شیخ مطالعہ کے لیے اپنے دفتر سے جامعہ کی لائبریری کی طرف پیدل نکلتے اور خادم کی حیثیت سے احقر بھی کبھی ساتھ ہو جاتا، تاکہ لائبریری میں ان کی مطلوبہ کتابوں کو تلاش کرنے اور ان کی میز تک پہنچانے کی سعادت مجھے میسر رہے اور اس دوران ان سے استفادہ کرنے کا کچھ موقع بھی ملے، لائبریری کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں احقر یہ دیکھتا کہ جب سامنے سے آتے ہوئے کوئی طالب علم شیخ کو دیکھ کر ان سے مصافحہ کے لیے مڑنے کا ارادہ کرتا تو اس طالب علم کے مڑنے سے پہلے شیخ اس کی طرف مڑ جاتے اور ہاتھ بڑھا کر سلام و مصافحہ اور مزاج پرسی کرتے، میں اس منظر کو دیکھ کر محو حیرت ہو جاتا کہ اتنی مصروفیت اور بڑھاپے کے باوجود شیخ کے بلند اخلاق و تواضع کا کیا ٹھکانہ ہے! کوئی بھی ادنیٰ طالب علم جب مصافحہ کرنے کے لیے ان کی طرف مڑنے کا ارادہ کرتا ہے وہ خود مڑ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں اور سلام و مصافحہ کے ساتھ نہایت شفقت کے انداز میں مزاج پرسی بھی کرنے لگتے ہیں۔

شام کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے فضیلۃ الشیخ عبدالفتاح ابو غدہ کے اخلاقِ فاضلہ اور صلاحیت و تقویٰ کو دیکھتے ہوئے مجھے نبی کریم ﷺ کی مندرجہ ذیل وہ دُعا یاد آ جاتی، جو آپ ﷺ نے سرزمینِ شام و یمن کی برکت کے لیے فرمائی تھی:

”عن ابن عمر عن النبي ﷺ قال: اللهم بارك لنا في شامنا و في يمننا“ (رواه البخاري، ج: ۱، ص: ۱۴۱)

اور یہ سوچتا کہ شاید نبی کریم ﷺ کی مذکورہ عمومی دُعا اور اس کی برکات میں سے ایک حصہ حضرت شیخ ابو غدّہ کو علمِ نافع، عملِ صالح اور بلند اخلاق کی صورت میں ملا ہے۔ شیخ ابو غدّہ اور شام سے تعلق رکھنے والے چند دیگر علمائے کرام کے علم و فضل، تقویٰ و طہارت اور تواضع و خاکساری کو سامنے رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل اُس حدیث کی طرف بھی ذہن منتقل ہو جاتا جس میں سرزمینِ شام کے حق میں خوشحالی اور اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ اس پر اللہ کے فرشتوں نے اپنے پر بچھائے ہوئے ہیں:

”عن زيد بن ثابت رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: طوبى للشام، قلنا: لأيّ ذلك يا رسول الله؟ قال لأن ملائكة الرحمن باسطة أجنحتها عليها“ (رواه الترمذی، ج: ۲، ص: ۲۳۲)

تحقیقی ذوق اور صحیح الفاظ کے انتخاب میں مہارت و پختگی

شیخ عبدالفتاح ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ کو عربی زبان کے مفردات اور اس کی نثر و نظم کا ایک بڑا سرمایہ محفوظ تھا، اسی طرح قواعدِ صرف و نحو اور مسائلِ فصاحت و بلاغت پر عبور حاصل تھا، وہ اپنے مضامین کے اندر مبہم، پیچیدہ یا ایسے الفاظ کو جگہ دینے کے روادار نہیں تھے جو غلط ہونے کے باوجود رواج پا گئے ہوں، اپنی تحریروں میں ان کی کوشش ہوتی کہ قاری کو کوئی دقت و پریشانی لاحق نہ ہونے دیں، وہ واضح الفاظ اور صاف ستھرے جملوں کو ترجیح دیتے، اور اگر ان کی تحریر میں کوئی ذرا سا مشتبہ یا

مشکل لفظ آجاتا تو اس پر اعراب و حرکات و سکنات ظاہر کر دیتے، اسی طرح اگر کسی دوسرے مصنف کی کتاب میں کوئی مبہم لفظ ان کے سامنے آتا تو اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے اور جب تک اُسے حل نہ کر لیتے انہیں چین نہیں آتا۔

ان کے شاگردِ رشید اور علمی جانشین شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ نے ان کے تحقیقی ذوق سے متعلق ایک چشم دید واقعہ لکھا ہے، جس کا مفہوم و ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

”ایک مرتبہ میں اپنے استاذِ محترم کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ اپنی عادت کے مطابق مجھے اپنے مہمان خانے لے گئے، میں نے دیکھا کہ مہمان خانہ کی تمام کرسیوں میں سے جن کی تعداد اچھی خاصی تھی ایک بھی بیٹھنے کے لیے خالی نہیں، سب کے اوپر کتابیں رکھی ہوئی ہیں، میں نے ہنستے ہوئے ان سے عرض کیا کہ خیریت تو ہوگی ان شاء اللہ! (یہ کیا منظر دیکھ رہا ہوں؟) شیخ نے ایک کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: اس کتاب کے اندر لفظ ”إِ حَالَة“ حاء مہملہ کے ساتھ میرے سامنے آیا جس سے متعلق مصنف لکھتے ہیں کہ: امام شافعیؒ اس کے قائل ہیں، میرے سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ”إِ حَالَة“ سے ان کی مراد کیا ہے؟ اور میں نے اس لفظ کی تلاش میں تین مہینے محنت کی اور اپنے چند مشائخ سے بھی معلوم کیا، لیکن جواب نہیں ملا، پھر میں نے ان تمام کتابوں میں سے ایک ایک کو یہاں لا کر اس کے اندر اس لفظ کو تلاش کیا، بالآخر مسئلہ حل ہو گیا اور معلوم ہوا کہ یہ لفظ ”إِ حَالَة“ نہیں، بلکہ حاء معجمہ کے ساتھ ”خَال يَخَالُ“ سے لیا گیا لفظ ”إِ حَالَة“ ہے بمعنی گمان کرنا، اور حضرات شوافع کے نزدیک اصول الفقہ کی کتابوں میں باب قیاس کے اندر علت سمجھنے کا ایک طریقہ ”إِ حَالَة“ ہے۔“

(امداد الفتاح، ص: ۱۳۰)

اسی طرح شیخ محمد عوامہ نے اپنے استاذِ گرامی سے متعلق ایک دوسرا واقعہ اس

طرح لکھا ہے:

”جب ہم مرحلہ ثانویہ کے سال اول کے طالب علم تھے تو ہمارے استاذ (شیخ امین اللہ عیروض رحمۃ اللہ علیہ) نے واقعہ بیان کیا کہ وہ چند ساتھیوں سمیت جن میں شیخ عبد الفتاح ابو غدہ بھی شامل تھے دمشق گئے اور ایک عالم کے حلقہ درس میں شریک ہوئے، اس دوران ایک لفظ کے تلفظ یا مفہوم میں (جو مجھے یاد نہیں رہا) شرکائے حلقہ کو اشکال پیش آیا، مدرس صاحب نے ایک طالب علم کو ”القاموس المحیط“ لانے کا حکم دے دیا تو ہمارے استاذ جنہوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے ان سے کہنے لگے کہ قاموس لانے کی کوئی ضرورت نہیں، اس لیے کہ یہاں پر بولتا ہوا قاموس شیخ عبد الفتاح ابو غدہ موجود ہیں، آپ لوگ جو چاہیں ان سے دریافت کر لیں۔“

(امداد الفتاح، ص: ۱۲۲)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ شیخ عبد الفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ غلط لفظ کو ہرگز برداشت نہیں کرتے تھے اور طلبہ کو بھی اس کے استعمال سے روکتے تھے، اور سبق کے دوران اہتمام کے ساتھ ایسے الفاظ کی نشاندہی کرتے جو غلط ہونے کے باوجود زباں زد ہو چکے ہوں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ”جامعة الملك سعود“ میں علوم الحدیث پڑھانے کے لیے جب شیخ درس گاہ تشریف لائے تو تخریج احادیث کے طریقے بتاتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”التلخیص الحبیر فی تخریج أحادیث الرافعی الكبير“ کا ذکر فرمایا، اور اس مناسبت سے کہا کہ بعض لوگ اس کتاب کو الف لام کے بغیر مضاف و مضاف الیہ سمجھ کر ”تلخیص الحبیر“ کے نام سے یاد کرتے ہیں جو کہ غلط ہے، اس لیے کہ یہ موصوف و صفت ہے اور صحیح لفظ الف لام کے ساتھ ”التلخیص الحبیر“ ہے، اور افسوس ہے کہ بیروت کے بعض اشاعتی اداروں نے بھی مذکورہ کتاب کا نام اس کی جلد پر غلط شائع کیا ہے، پھر شیخ نے تختہ سیاہ پر (نوٹ) لکھ کر اس کے نیچے مذکورہ بالا تحقیق کا خلاصہ لکھا اور طلبہ کو اپنی کاپیوں میں نقل کرنے کا حکم دے دیا۔

شیخ عبد الفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مزید کچھ عرصہ تک رہنے کی تمنا و کوشش

احقر نے ”جامعة الملك سعود“ میں دو سال (۱۴۰۸ھ-۱۴۰۹ھ) گزار کر شعبہ ”معهد اللغة العربية“ کے آخری کورس ”إعداد المعلمين“ سے بھی فراغت حاصل کر لی، اس کے بعد قانونی طور پر میں ”جامعة الملك سعود“ میں مزید قیام نہیں کر سکتا تھا۔ ادھر دارالعلوم دیوبند کی تدریسی خدمت سے بھی مجھے صرف دو سال کی چھٹی ملی تھی جس کی مدت پوری ہو گئی تھی، لیکن دل یہ چاہ رہا تھا کہ فضیلتہ الشیخ عبد الفتاح ابو غدہ کی خدمت میں مزید کچھ عرصہ تک رہنے کا موقع ملے، تاکہ صرف سامع کی حیثیت سے نہیں بلکہ باضابطہ طور پر ان کے حلقہ درس میں شامل ہو کر ان سے استفادہ کر سکوں، میں نے اپنی اس آرزو کا اظہار جب شیخ ابو غدہ سے کیا تو انہوں نے اس کی تائید فرمائی، اور ان ہی کے مشورہ سے میں نے اگلے تعلیمی سال ۱۴۱۰ھ کے لیے ”کلیة التربية“ کے شعبہ ”الثقافة الاسلامیة- تخصص فی التفسیر والحديث“ مرحلہ ایم- اے میں داخلہ لینے کی درخواست پیش کر دی۔ مذکورہ مرحلہ میں غیر ملکوں کا داخلہ تقریباً ممنوع تھا، لیکن احقر کی درخواست کو اس وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا کہ احقر نے اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اپنے بزرگوں کی دعاؤں کی برکت سے شعبہ ”معهد اللغة العربية“ میں اعلیٰ اور امتیازی نمبرات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ طالب مثالی کی سند اور پورے جامعہ کی سطح پر چار سونے کے تمغے (گولڈ میڈل) بھی حاصل کر لیے تھے، چنانچہ میری درخواست کا ردوائی کے لیے منظور ہو گئی اور جامعہ کے نظام کے مطابق پانچ پروفیسروں پر مشتمل کمیٹی نے میرا انٹرویو لیا، کمیٹی میں محترم

ڈاکٹر نعمان السامرائی، محترم ڈاکٹر احمد چلی، محترم ڈاکٹر حسین الترتوری، محترم ڈاکٹر شا کر فیاض، محترم ڈاکٹر عبدالرحمن المطر ودی شامل تھے۔ انٹرویو میں پانچ چیزیں پیش نظر تھیں: نمبر ایک یہ کہ طالب کی سابقہ سند کس حیثیت کی حامل ہے؟ نمبر دو یہ کہ تفسیر و حدیث میں اس کی صلاحیت کیسی ہے؟ نمبر تین یہ کہ معلوماتِ عامہ میں اس کی قابلیت کتنی ہے؟ نمبر چار یہ کہ طالب علم کی شخصیت کیسی ہے؟ نمبر پانچ یہ کہ عربی زبان میں اس کی صلاحیت کیسی ہے؟۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے انٹرویو میں کامیابی ہوئی اور مذکورہ پانچوں امور میں سے ہر ایک کے سامنے بالترتیب ”ممتاز“ لکھا گیا اور آخر میں یہ لکھا گیا کہ مقررہ کمیٹی مذکورہ طالب علم کے داخلہ کی سفارش کرتی ہے اور پھر پانچوں پروفیسر حضرات نے دستخط کر دیئے، اس انٹرویو کی بنیاد پر ”كلية التربية - قسم الثقافة الإسلامية“ کے محترم نگراں ڈاکٹر حمدان بن محمد الحمدان نے داخلہ کے لیے میری نامزدگی کی تصدیق کرتے ہوئے اگلے سال کے لیے میرا تعلیمی وظیفہ جاری کرنے کی تحریر متعلقہ شعبہ جات کو ارسال کر دی، جس کی بنیاد پر سالانہ چھٹیوں کے بعد مجھے نیا تعلیمی ویزا مل جاتا اور دارالعلوم دیوبند میں میرے پتہ پر ارسال کر دیا جاتا۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب کے نام شیخ عبدالفتاح ابو غدہ کی ایک تحریر

مذکورہ بالا مراحل کے بعد اگلے سال ۱۴۱۰ھ کے لیے دراساتِ علیا کلیۃ التربية میں میرا داخلہ یقینی ہو گیا تھا جس سے شیخ عبدالفتاح ابو غدہ کی خدمت میں

مزید کچھ عرصہ تک رہنے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع مل جاتا، البتہ ایک اہم مرحلہ ابھی باقی تھا اور وہ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے مزید چھٹی ملنے کا مرحلہ تھا! کیونکہ میں دارالعلوم کا مدرس تھا اور دارالعلوم نے میری صرف دو سال کی چھٹی کی منظوری دی تھی جس کی مدت پوری ہو چکی تھی، لہذا میں نے شیخ عبدالفتاح ابو غدہ سے درخواست کی کہ آپ حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے نام ایک تحریر عنایت فرمادیں جس میں ان سے میری مزید چھٹی منظور کرنے کی سفارش کی گئی ہو! شیخ نے خوشی کے ساتھ میری گزارش منظور فرماتے ہوئے حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب کے نام مندرجہ ذیل سفارشی تحریر لکھ کر میرے حوالہ کر دی۔ تحریر کے ایک ایک لفظ سے شیخ کی بے انتہا تواضع و بلند اخلاق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اور انہوں نے اس ناکارہ شاگرد سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے وہ میں اپنے لیے فالِ نیک اور باعثِ سعادت تو ضرور سمجھتا ہوں، تاہم اپنے آپ کو ان اوصاف کا حامل ہرگز تصور نہیں کرتا جو شیخ نے ذرّہ نوازی فرماتے ہوئے میرے متعلق ذکر کر دیئے ہیں، بلکہ میں وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے حسنِ ظن (جو ایک کامل و متقی مؤمن کا شیوہ ہوا کرتا ہے) اور خوردنوازی و شفقت کے تحت اپنے اس ادنیٰ شاگرد کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، تحریر کا عکس اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے:

شیخ عبدالفتاح ابو غده رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کا عکس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

إلى سماحة الشيخ الجليل والعلامة البليل مولانا مرقوب الرحمن
مدير الجامعة الإسلامية دار العلوم ديوبند حفظه الله تعالى وأستع به

مع محبة وراجي دعواته عبد الفتاح أبرغنة

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته .

وبعد فأحمد الله تعالى عليكم ، وأرجو أنه تكونوا أنتم ومن في حضرتكم الشريفين
بكل خير وجهود وعافية ونعمة .

لقد أكرمنا الله تعالى بسلامة صحتكم ، ووافر خيرتكم ، هذا الألف
الفاضل الشيخ عبد الرؤوف خان عبد الدود ، فقد كان ترجمان خير
لجامتكم ونيل صدوره للتحفة عليكم ، فقد حظي بحب كل عارفه ،
مع لبيب سيرته وأخلاقه الرقيقة ، ومعه هذه العلمي وزكائه
الفطري وصفاته الروحي والقي ، فقد أحسنتم الفرس وأطمت
الوفارة ، وهو قد تفرغ بالعبء الضيف هيا (راجي زاورم) ،
نطلب به فامتنا هنا تمديد دراسة ، وهيا منهم له وتقدير لمواهبه
وأخلاقه الزكية أجا برا طلبة بالشرع ورفع .

فإذا علمتم بالموافقة من استمرار بقاءه يكون في ذلك خير كثير
إن شاء الله تعالى ، له ولجامتكم ولجامتنا ، فانه المثال الصحيح
قليل ، والمثال المملوك كثير وكثير جدا ، فأكبروا ببقائه عندنا ولرسنة
واحدة ، والله بجزية المنصديه ، وتقبلوا أطلب تحياتي واحترامي
لسماحتكم ، مع رجاء دعوائكم ، دافع تحياتي لساكناتنا المشايخ الكرام
فاسألكم ، واستدكم الله إلى لقاء قريب جيب باذنه ، والسلام عليكم

عبد الفتاح

۱۵۰۹/۱۸/۵۸

درجۃ اللہ .

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بخدمت شیخ معظم و مکرم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند حفظہ اللہ وَاُفْتَحَ بِہِ ان کے مخلص دوست اور ان کی دعاؤں کے طلبگار عبدالفتاح ابو نعیمہ کی طرف سے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد از سلام الحمد للہ! میں ٹھیک ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ اور آپ کے متعلقین خیر و خوشی اور عافیت و نعمت سے سرشار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کے ایک سچے ترجمان اور بہترین نمایندہ برادرِ باکمال شیخ عبدالرؤف خان عبدالودود کے ذریعہ ہمیں اعزاز بخشا، موصوف آپ کے جامعہ کے ایک بہترین نمایندے اور آپ کے ایک سچے شاگرد ثابت ہوئے، وہ اپنے صاف سحرے طرزِ عمل و بلند اخلاق، علمی جدوجہد و فطری ذہانت اور روحانی و نفسیاتی پاکیزگی کی بدولت اپنے تمام جاننے والوں کی محبت سے بہرہ ور ہو گئے، جس سے یہ اندازہ ہوا کہ آپ نے اچھا پودا لگایا ہے اور عمدہ نمایندہ کا انتخاب فرمایا ہے۔ موصوف نے اس کمزور بندہ سے عقیدت و محبت کا تعلق قائم رکھا (جو درحقیقت ورم والے کو مومن سمجھنے کے مترادف ہے) اور جامعہ میں مزید پڑھنے کی درخواست پیش کی اور جامعہ کے ذمہ داروں نے ان سے محبت کی خاطر اور ان کی صلاحیتوں اور پاکیزہ اخلاق کے احترام میں شرح صدر و خوشی کے ساتھ ان کی درخواست کو شرفِ قبولیت سے نوازا۔

لہذا اگر آپ بھی ان کو یہاں پر مزید رہنے کی اجازت عنایت فرمائیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ! یہ موصوف کے حق میں اور آپ کے جامعہ اور ہمارے جامعہ کے حق میں

زیادہ بہتر ہوگا، اس لیے کہ بہترین نمونہ کا وجود شاذ و نادر بنتا جا رہا ہے اور ناقص نمونوں کے وجود میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، پس کم از کم ایک سال کے لیے آپ ان کو ہمارے پاس رہنے کی اجازت مرحمت فرمائیں، اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو جزائے خیر عطا فرماتے ہیں، اور ایک مرتبہ پھر آپ کے حضور میں خراج عقیدت و احترام پیش کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ ہمیں دعا میں یاد فرمائیں گے اور آپ کے یہاں جو دیگر ہمارے قابلِ احترام مشائخ ہیں ان کی خدمت میں بھی سلام پیش فرمائیں گے، اور آپ کو اس امید کے ساتھ اللہ کے سپرد کرتا ہوں کہ اللہ عن قریب ایک خوشگوار ملاقات کا موقع عطا فرمائیں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔
آپ کا مخلص

عبدالفتاح ابوغدہ

۲۸/۱۱/۱۴۰۹ھ

”جامعة الملك سعود“ سے احقر کی دارالعلوم

دیوبند واپسی

”جامعة الملك سعود“ میں اپنا دو سالہ کورس ۱۴۰۸ھ-۱۴۰۹ھ کو مکمل کرنے کے بعد حضرت شیخ ابو غدہ کی مذکورہ بالا تحریر کے ساتھ احقر کی دارالعلوم دیوبند واپسی ہوئی، ارادہ یہ تھا کہ اگر دارالعلوم نے اجازت دی تو مزید کچھ عرصہ تک ”جامعة الملك سعود“ جا کر حضرت شیخ ابو غدہ سے استفادہ کروں گا، لیکن جب میں نے شیخ کی تحریر حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں پیش کر دی اور ان سے اور اپنے اساتذہ کرام سے مشورہ طلب کیا تو سب نے یہ مشورہ دیا کہ تمہیں دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا جو موقع نصیب ہوا ہے یہ بہت بڑی سعادت اور علمی ترقی کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے، اور سلسلہ تدریس میں طویل انقطاع مناسب نہیں معلوم ہوتا، لہذا بہتر یہ ہوگا کہ تم نے جو دو سال ”جامعة الملك سعود“ میں گزارے ہیں اور اس دوران شیخ ابو غدہ سے استفادہ کا موقع بھی ایک حد تک حاصل کر لیا ہے، اسی پر اکتفا کریں اور دارالعلوم کی ضرورت اور تدریس کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے سعودی عرب جانے کا ارادہ ترک کریں۔ حضرت مہتمم صاحب اور اساتذہ کرام کے اس مشورہ کے بعد سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا، اس لیے ان کا حکم اپنے

لیے سعادت سمجھتے ہوئے سعودیہ جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور فوری طور پر سال ۱۴۱۰ھ کو دوبارہ دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا آغاز کر دیا اور حضرت شیخ ابو غدہ سے مزید استفادہ کرنے کی تمنا پوری نہ ہو سکی، جس کا احساس آج تک باقی ہے۔

”جامعۃ الملک سعود“ کے ماحول میں اپنے مسلک پر احقر

کا ثابت قدم رہنا اور اس کے اسباب

سعودی عرب کی درسگاہوں میں پڑھنے والے اپنے ہی مسلک کے بعض طلبہ کو دیکھا گیا ہے کہ وہ وہاں کے ماحول سے متاثر ہو کر اپنے مسلک میں کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا احقر پر یہ خصوصی کرم رہا کہ تقریباً دو سال تک وہاں پر رہنے کے باوجود مسلک میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی، بلکہ غیر مقلدین کی بے ضابطگیوں کو قریب سے دیکھ کر اپنے مسلک میں مزید پختگی پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق و فضل و کرم کے بعد اس ثابت قدمی کے ظاہری اسباب چار تھے:

۱:..... میرے استاذ و مرشد فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی

قدس سرہ صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کی دعاؤں اور ان سے رابطہ میں رہنے کا اثر اور ان کی نسبت و تربیت کی برکات۔

۲:..... حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہم العالی شیخ

الحدیث دارالعلوم دیوبند سے بذریعہ تحریر مسلسل رابطہ اور ان کی نصیحتیں۔

۳:..... حضرت شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلق اور ان کی شفقتیں۔

۴:..... حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی قدس سرہ فاضل دارالعلوم

دیوبند و استاذِ حدیث و تفسیر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کی ایک پر اثر اور جامع و مختصر نصیحت ”جاؤ! لیکن خیال رکھنا کہیں وہاں پر اغواء نہ ہو جاؤ“ جس کا تذکرہ اس سے پہلے کر چکا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مذکورہ بالا چار اسباب کی برکت سے یہ بھی ہوا کہ جب میرا اپنا دو سالہ کورس مکمل ہو گیا اور طالبِ مثالی کی خصوصی سند اور سونے کے چار تمغوں اور دیگر انعامات سے مجھے نوازا گیا تو ”معهد اللغة العربية“ کے مدیر جناب ڈاکٹر محمد یاسین النبی کے توسط سے سعودی عرب کی وزارتِ الاعلام نے پرکشش رعایتوں کے ساتھ مجھے ملازمت دینے اور سعودی عرب میں بچوں سمیت مقیم ہونے کی تحریری پیشکش کر دی! اللہ تعالیٰ نے اسی وقت حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی قدس سرہ کی مندرجہ بالا نصیحت یاد دلادی، اور بغیر کسی تامل کے میں نے شکریہ کے ساتھ اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت کر لی، اور شاید اسی نصیحت پر عمل کرنے کا ثمرہ ہے کہ چند سال بعد اللہ تعالیٰ نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں حدیث کی خدمت کا موقع نصیب فرمایا، ولله الحمد و المنة۔

شیخ عبدالناح ابو غدہ سے احقر کی آخری ملاقات اور ان کی طرف سے اجازتِ حدیث

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ماہِ رجب ۱۴۱۵ھ کو احقر زیارتی ویزا پر سعودی عرب گیا اور ارادہ یہ تھا کہ حرمین شریفین کی حاضری کے ساتھ ساتھ ”جامعة الملك سعود ریاض“ جا کر وہاں کے اساتذہ کرام اور بالخصوص حضرت شیخ عبدالفتاح

ابو غدہ کی خدمت میں بھی حاضری دوں گا، چنانچہ ۱۸/رجب ۱۴۱۵ھ کو ریاض میں شیخ کی قیام گاہ پر حاضری نصیب ہوئی، شیخ نے اپنی عادتِ جمیلہ کے مطابق مہمان خانہ میں بٹھایا اور میری حیثیت سے کافی بڑھ کر اکرام فرمایا اور اپنی تصنیفی و تحقیقی مصروفیات میں سے ایک اچھا خاصا وقت نکال کر مجھے اپنے علمی ملفوظات اور پند و نصائح سے نوازا اور ساتھ ساتھ انہوں نے افغانستان کے اپنے تازہ سفر کا تذکرہ بھی فرمایا جو مجاہدین کے درمیان مصالحت کے لیے کیا گیا تھا اور افغانستان کے چند شہروں جیسے ہرات، کابل اور بلخ اور وہاں کے علماء کے علمی کارناموں اور تاریخی واقعات کا تذکرہ کیا، جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ اس سلسلہ میں کوئی مضمون یا رسالہ لکھنا چاہتے ہیں۔

انہوں نے اپنے تحقیقی ذوق کے مطابق افغانستان کے ایک شہر ”شین دَند“ کا تذکرہ بھی کیا جس کی زیارت انہوں نے اس تازہ سفر میں کی تھی، اور چونکہ اس شہر کا نام پشتو زبان کا لفظ ہے، اس لیے مجھے حکم دیا کہ زبانی طور پر اس کا صحیح تلفظ اور تحریری طور پر اس کی صحیح کتابت دونوں بتا دو، تعمیل حکم پر مجھے دعاؤں سے نوازتے ہوئے فرمایا کہ: میں اس میں ایک الف کا اضافہ کرتے ہوئے ”شین دَاند“ بولتا اور لکھتا تھا۔

اس نشست میں میں نے ادب کے ساتھ شیخ سے اجازتِ حدیث کی درخواست کی، اس لیے کہ جس وقت ”جامعۃ الملک سعود“ میں سامع کی حیثیت سے میں ان کے درسِ اصول الحدیث میں حاضر ہوا کرتا تھا اس وقت میں ان کے حلقہٴ درس کا باضابطہ طالبِ علم نہیں بلکہ صرف سامع تھا، اور سامع بھی

روایتِ حدیث کا نہیں بلکہ درسِ اصول الحدیث کا، اور چونکہ اس وقت ارادہ یہ تھا کہ اگلے سال ان شاء اللہ! ان کے باقاعدہ شاگرد کی حیثیت سے حاضری ہوگی اور پھر اجازتِ حدیث کی صورت بھی پیدا ہو جائے گی، لہذا اُس سے پہلے ان سے اجازتِ حدیث کی درخواست نہ کر سکا، لیکن جیسا کہ اس سے پہلے لکھ چکا ہوں دارالعلوم دیوبند کی طرف سے مجھے مزید چھٹی نہ مل سکی اور شیخ کی خدمت میں باضابطہ طالبِ علم کی حیثیت سے حاضری کی تمنا دل ہی دل میں رہ گئی۔

بہر صورت! اس ملاقات میں ہمت کر کے میں نے ان سے اجازتِ حدیث کی درخواست کی! انہوں نے صرف زبانی ہی نہیں بلکہ تحریری طور پر ایک خصوصی اجازت نامہ سے سرفراز فرمایا، اور وہ اس طرح کہ ان کے سب سے محبوب استاد حضرت علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۱ھ) کی اسانید کا مجموعہ جو ”التحریر الوجیز فیما یبتغیہ المستجیز“ کے نام سے ایک سوساٹھ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ کی شکل میں چھپ چکا تھا دکھایا اور فرمایا کہ اس مجموعہ کے محدود نسخے میں نے اس مقصد کے لیے چھپوائے ہیں کہ اپنے بعض مخصوص ساتھیوں (شاگردوں) کو اجازتِ حدیث دیتے ہوئے اپنے شیخ حضرت علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ”ثبوت“ (اسانید کا مجموعہ) بھی پیش کیا کروں گا، تاکہ ان کو شیخ کی اسانید کا پتہ بھی چلے اور میرے ساتھ ساتھ میرے شیخ اور ان کے مشائخ سب کو دعاؤں میں یاد رکھا کریں، پھر انہوں نے اُس رسالہ کے سرورق پر اپنے ہاتھ سے تحریری اجازت نامہ لکھ کر مجھے عنایت فرمایا، قارئین کی دلچسپی کے لیے اجازت نامہ کا عکس درج کیا جا رہا ہے:

شیخ عبدالفتاح ابو غدہ کی طرف سے اجازت نامہ حدیث کا عکس

بسم الله الرحمن الرحيم الحمد لله والصلاة والسلام على سيدنا محمد وآله،
وبعد فقد أجزت الألف الكريم المحب في الله الشيخ عبد الرؤوف خان
ابن عبد الوود الأذخالي - كاتبة الله له - وبلغه من الخير طله - بما
أجاز في به شيوخهم رحمهم الله تعالى رجاء دعواتهم ، وفي طبعهم شئنا
الإمام أكثرنا صاحب هذا البث ، وبما صح لي وعني ، آمدا منه أن
يذكرني بصلاح دعواته ، وأدريه ونفسي بتقوى الله في السر والعلن ،
والله ولي المتقين . قاله وكتبه عليه السلام في الرياض ١٤٥٥/٧/١٨

الخَيْرُ الْخَيْرُ الْخَيْرُ الْخَيْرُ الْخَيْرُ

شیخ ابو غدہ کی ایک اہم نصیحت

حضرت شیخ ابو غدہ نے اس نشست میں اجازت حدیث کی مناسبت سے برصغیر
کے دینی مدارس کا ذکر کرتے ہوئے ان کی دینی اور اصلاحی خدمات کو سراہا اور
ساتھ ساتھ حدیث پڑھانے والے بعض حضرات کے طرز تدریس کے ایک قابل
اصلاح پہلو کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا کہ: ”برصغیر کے مدارس میں حدیث
پڑھانے والے بعض حضرات سال کے شروع میں اتنی لمبی تقریریں کرتے ہیں کہ
زیادہ تطویل کی وجہ سے طلبہ کے لیے ناقابل فہم اور غیر مفید ہوا کرتی ہیں اور سال

کے آخر میں چونکہ کتاب کا اکثر حصہ باقی رہ جاتا ہے اور ختم کرانا ضروری ہوتا ہے تو نہایت مختصر بات کرتے ہیں یا صرف عبارت پر اکتفا کرتے ہوئے ایک ہی گھنٹہ میں تقریباً ایک سو حدیثیں پڑھاتے ہیں، جس سے طلبہ کو بڑا نقصان ہوتا ہے، شیخ نے اس طرزِ تدریس پر تنقید فرماتے ہوئے مجھے نصیحت کی کہ تم شروع سے آخر تک اعتدال و پابندی کے ساتھ پڑھانے کی کوشش کرو اور میری یہ گزارش حدیث پڑھانے والے دوسرے حضرات تک بھی پہنچا دو۔“

حضرت علامہ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ قدس سرہ العزیز کی مذکورہ بالا نصیحت سے مجھے بڑا فائدہ محسوس ہوا، اور میں اس مضمون کے ذریعہ شیخ کے حکم کے مطابق ان کی مذکورہ نصیحت کو حدیث پڑھانے والے دوسرے اہل علم حضرات تک بھی پہنچانا چاہتا ہوں، جیسا کہ اس سے قبل عربی مجلہ ”البینات“ شمارہ نمبر: ۴، ۱۴۲۵ھ اور دارالعلوم دیوبند کے عربی مجلہ ”الداعی“ شمارہ نمبر ۳، ۴ ماہ ربیع الاول - ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ میں میرے عربی مضمون کے اندر شیخ کی یہ نصیحت شائع ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

شیخ ابو غدہ کی وفات اور مسجدِ نبوی میں نمازِ جنازہ اور جنت البقیع میں تدفین

حضرت علامہ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ نے سنہ ہجری قمری کے حساب سے اپنی مستعار زندگی کے اکیاسی سال اور چند مہینے، اور سنہ میلادی شمسی کے حساب سے تقریباً اُناسی سال اس دارِ فانی میں گزار کر بروز یکشنبہ ۹/۱۰/۱۴۱۷ھ مطابق ۱۶/۲/۱۹۹۷ء فجر کے وقت ریاض کے ایک ہسپتال ”مستشفى الملك فيصل التخصصي“ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور بروز دو شنبہ ۱۰/۱۰/۱۴۱۷ھ شاہی

فرمان کے مطابق ان کی نعش کو خصوصی طیارہ کے ذریعہ مدینہ منورہ منتقل کیا گیا، جہاں مسجد نبوی میں بعد نمازِ عشاء ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی جس میں ایک جمعِ غفیر نے شرکت کی، نمازِ جنازہ کے بعد ان کے جسدِ خاکی کو جنت البقیع میں سپرد خاک کیا گیا۔

اللہ اُن کی لحد پر شبنم افشانی کرے

شیخ نے اپنے پیچھے ہزاروں شاگرد اور تالیفات و تحقیقات کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا، جن میں سے باسٹھ کتابیں ان کی زندگی میں شائع ہو کر مقبولِ خاص و عام بن گئی تھیں، اور بعض زیرِ طباعت اور بعض پر کام جاری تھا کہ ان کا وصال ہو گیا، اب ان کے علمی و تحقیقی کاموں کی تکمیل میں ان کے باکمال و باصلاحیت صاحبزادے شیخ سلمان ابوغدہ حفظہ اللہ لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شیخ ابوغدہ کو جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ نصیب فرمائے اور ان کی تالیفات اور علمی و اصلاحی کارناموں سے لوگوں کو تار و ز قیامت مستفید و مستفیض ہونے کا موقع عنایت فرمائے۔

دائرۂ علوم دیوبند کا نیازمندانشفر

خود ساقی کوثر نے رکھی مئے خانے کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے دیوانوں کی روداد یہاں
(مولانا ریاست علی ظفر بیجنوری)

دارالعلوم دیوبند کا نیاز مندانه شرف

دارالعلوم دیوبند کا افتتاح بروز پنجشنبہ ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء مسجد چھتہ دیوبند کے کھلے صحن میں انار کے ایک چھوٹے درخت کے نیچے نہایت سادگی کے ساتھ کسی رسمی تقریب و نمائش کے بغیر اہل اللہ کی ایک جماعت کے ذریعے۔ جس کے سرخیل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۲۹۷ھ) تھے۔ عمل میں آیا۔ صلحاء و اہل اللہ کی اس جماعت کے پاس اس مدرسہ کے لیے نہ کوئی عمارت تھی، نہ عمارت بنانے کا سرمایہ، نہ پروپیگنڈہ تھا، نہ اعلان و اشتہار کا تخیل، اخلاص و خدمتِ دین اور توکل علی اللہ ان کا سب سے بڑا سرمایہ تھا۔

اس ادارہ کے قیام کا بنیادی مقصد اسلامی عقیدہ کا تحفظ، کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم و ترویج، بدعات و غیر اسلامی رسومات کا خاتمہ، مسلمانوں کی عظمت و رفقہ کی بحالی اور ان میں دینی حمیت و اسلامی غیرت کا جذبہ بیدار کرنا تھا۔ بانیان کے اخلاص و توکل علی اللہ کی برکت سے یہ چھوٹا سا گمنام مدرسہ ترقی کی طرف گامزن ہوا اور کچھ ہی عرصہ کے بعد برصغیر کا سب سے بڑا دینی ادارہ بن کر ”از ہر الہند“ کے لقب سے موسوم ہوا، اور کرۂ ارض کے ہر حصہ سے آنے والے تشنگانِ علومِ نبوت کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس کی شہرت و مقبولیت کی آواز مشترکہ ہندوستان سے نکل کر جہاں افغانستان، بخارا و سمرقند کے پہاڑوں میں گونجنے لگی، وہاں عالمِ عرب کے

ریگستانوں اور افریقہ کے جنگلات تک بھی جا پہنچی۔ حسن نیت، اخلاص و للہیت اور توکل علی اللہ کے کرشمے اسی طرح ہوا کرتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا پہلا سفر

رواں پندرھویں صدی ہجری کے شروع میں جب راقم الحروف افغانستان و پاکستان کے سرحدی علاقوں کے دینی مراکز میں فنون کی کتابوں میں منہمک اور زیرِ تعلیم تھا، اس نے بعض مشفق اساتذہ کرام کی ترغیب اور والدین محترمین کی اجازت سے دارالعلوم دیوبند جانے کا ارادہ کیا، تاکہ ایک ایسے سرچشمہ فیض و برکت سے علمی پیاس بجھانے کا موقع ملے جس کے بعد کسی اور سرچشمہ کو تلاش کرنے کی کوئی خاص ضرورت باقی نہ رہے۔

احقر کے پاس اس سفر کے لیے درکار وسائل اگرچہ نہ ہونے کے برابر تھے، تاہم اس اعتماد کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ طالب علم کے لیے آسانیاں پیدا فرماتا ہے، اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ سفر کے دوران مختلف دشواریوں کا سامنا ہوتا رہا، لیکن امدادِ خداوندی سے ان دشواریوں سے نکلنے کے راستے بھی بنتے رہے، یہاں تک کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا موقع نصیب ہوا، اور امتحانِ داخلہ میں اعلیٰ نمبرات سے کامیابی کے ساتھ دورہ حدیث کے اندر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ ہو گیا، اس داخلہ کی وجہ سے جو خوشی احقر کو حاصل ہوئی تھی وہ پوری زندگی کی ایک یادگار خوشی تھی اور میری کیفیت اس شعر کے مطابق تھی:

شکرِ خدا کہ ہرچہ طلب کردم از خدا
بر منتہائے مقصد خود کامران شدم

بہر صورت! دورہ حدیث میں اپنے عظیم المرتبت اساتذہ کے پاس پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک سال کے بعد فراغت ہوئی۔ امتحان سالانہ میں اللہ کی توفیق اور اساتذہ کرام کی دعاؤں کی برکت سے اپنی جماعت دورہ حدیث میں بھی اور پورے دارالعلوم کی سطح پر بھی پہلی پوزیشن حاصل کی، اور اگلے سال کے لیے آسانی کے ساتھ شعبہ افتاء (تخصص فی الفقہ) میں داخلہ ہوا جس کی مدت تعلیم ایک سال ہوا کرتی تھی، اس شعبہ کے سالانہ امتحان میں بھی بحمد اللہ و توفیق پہلی پوزیشن حاصل کر لی۔ اس کامیابی کی بنیادی وجہ اللہ کی توفیق کے بعد دارالعلوم دیوبند کا با مقصد و منظم تعلیمی نظام، اساتذہ کرام کا تمام طلبہ اور بالخصوص غیر ملکی طلبہ کے ساتھ نہایت شفقت و الفت کا معاملہ اور ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دینا تھی۔

امامت و خطابت اور تدریس کی ذمہ داری

دورہ حدیث کے سال ہی احقر کو دارالعلوم دیوبند کی مسجد (مسجد قدیم) کا امام و خطیب مقرر کیا گیا اور فراغت کے بعد اپنے اساتذہ کرام و بزرگوں کے حکم و مشورہ سے تدریس کے لیے درخواست دی۔ مجھے اپنی علمی کم مائیگی، کم عمری، عملی کمزوری اور نا تجربہ کاری کا پورا احساس تھا اور اپنے آپ کو ہرگز دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا اہل نہیں سمجھتا تھا اور نہ ہی درخواست دینے کی جرأت کرتا، لیکن اپنے اساتذہ کرام کے حکم و مشورہ کو ہمیشہ اپنے لیے باعث خیر و برکت سمجھنا اور اپنے احساسات پر اس کو ترجیح دینا اپنا معمول بن چکا تھا، لہذا اس معاملہ میں بھی اپنے احساس کو دباتا ہوا اساتذہ کرام کے مشورہ پر عمل کیا، چنانچہ دارالعلوم کے نظام کے

مطابق اکابرین کی ایک کمیٹی نے انٹرویو لیا، جس کے نتیجے میں احقر کا تقرر بحیثیت مدرس عمل میں آیا اور ماہ ربیع الاول ۱۴۰۳ھ کو باقاعدہ تدریس کا آغاز بھی کر دیا۔ دارالعلوم دیوبند میں تقرری کے بعد احقر کو اپنے اساتذہ کرام سے استفادہ کرنے کا بہترین موقع میسر آیا، اس لیے کہ عملی تجربہ شروع کرنے کے دوران چھوٹوں کو بڑوں کی رہنمائی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، اور چونکہ ان کو ذمہ داری کا احساس شروع ہونے لگتا ہے تو استفادہ کی طرف توجہ بھی زیادہ دیتے ہیں۔ چنانچہ احقر نے یہ ہرگز خیال نہیں کیا کہ میں مدرس بن چکا ہوں، بلکہ یہ تصور قائم کیا کہ طالب علمی کا حقیقی دور تو اب شروع ہوا ہے، اساتذہ کرام کا سایہ عطوفت موجود ہے، عملی میدان میں قدم رکھ رہا ہوں، لہذا مجھے پوری توجہ اپنے مشفق اساتذہ کے تجربات سے استفادہ کرنے پر مرکوز کرنی چاہیے۔

لہذا! اساتذہ کرام کے نظام الاوقات اور ان کے مراتب کی رعایت کرتا ہوا ان سے ملاقات کرنے اور ان سے تدریسی، تربیتی اور عملی میدان میں استفادہ کرنے کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا۔ حضرت الاستاذ، فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہ سے اصلاحی تعلق کا سلسلہ بھی قائم ہوا اور ان کی اصلاحی و علمی مجلسوں میں حتیٰ الامکان شریک ہونے کا بھی اہتمام کیا۔ میرے تمام اساتذہ کرام کو اللہ تعالیٰ بہترین صلہ عطا فرمائے جنہوں نے ہر قدم پر رہنمائی فرمائی اور کبھی بھی مجھے مایوس یا محروم نہیں ہونے دیا۔

امامت و خطابت، تعلیم و تدریس اور اساتذہ کرام کے زیرِ سایہ رہ کر ان سے استفادہ کرنے کا یہ سلسلہ تقریباً دس سال تک جاری رہا، ان دس سالوں میں

دارالعلوم دیوبند اور اس کی پُرکِیف علمی و عملی فضاء سے محبت و تعلق اتنا مضبوط ہو گیا کہ میرے تصور و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اپنی زندگی میں کبھی اس بابرکت ماحول سے جدا ہوں گا، بلکہ یہی تمنا تھی کہ اپنی زندگی کی آخری رمتک یہیں رہوں اور یہیں سے میرا جنازہ اٹھے اور اپنے بزرگوں کے اقدامِ عالیہ میں مزارِ قاسمی کے اندر مدفون ہونے کی سعادت نصیب ہو۔ لیکن تقدیرِ خداوندی کچھ اور تھی۔ ۱۲/شعبان ۱۴۱۲ھ کو حضرت والد ماجد کا مضافاتِ کوئٹہ بلوچستان میں انتقال ہوا (رحمہ اللہ تعالیٰ) اور والدہ محترمہ (بارک اللہ فی صحتها و عافيتها و حیاتها) نے مجھے حکم دیا کہ اپنی والدہ، بھائیوں اور بہنوں کو سنبھالنے کے لیے اب تمہارا پاکستان آنا ناگزیر ہو گیا ہے، لہذا اللہ پر توکل کر کے مستقل طور پر واپس پاکستان آ جاؤ۔

دارالعلوم دیوبند سے فراق کا غم

دارالعلوم دیوبند کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ اگر کوئی طالب علم صرف ایک ہی سال وہاں پڑھ کر فارغ التحصیل ہو جاتا ہے اور اگلے سال اس کو جانا ہوتا ہے تو وہ غمِ فراق میں تڑپتا رہتا ہے، اور اگر کسی کو کچھ زیادہ عرصہ دارالعلوم میں پڑھنے کا موقع مل جاتا ہے اور دارالعلوم کی محبت اس کی رگ و پے میں پیوست ہو جاتی ہے اور پھر اس سے جدائی کا وقت آ جاتا ہے تو اس کی بے تابی و پریشانی ایسی ہوتی ہے کہ دیکھنے والوں کو بھی غم میں مبتلا کر دیتی ہے۔

اب غور فرمائیے! ایک طالب علم جو بڑی دشواریوں کے بعد اس بابرکت ادارہ میں پہنچا ہو، اور پھر فراغت کے بعد اللہ تعالیٰ نے مزید دس سال تک وہاں پر تدریس کا موقع اور ساتھ ساتھ امامت و خطابت کا موقع عنایت فرمایا ہو، اور جب

بھی کوئی علمی دشواری پیش آئی ہو تو حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہم العالی اور دیگر مشفق اساتذہ کرام سے استفادہ کی صورت میسر رہی ہو اور اپنے استاذ و مرشد مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی صدر مفتی دارالعلوم دیوبند قدس سرہ سے اصلاحی تعلق کا سلسلہ قائم ہو گیا ہو اور ان کی صحبت میں رہنے کی سعادت کا موقع مل رہا ہو، تو ایسے عاجز بندے کو اس ادارہ کے درو دیوار اور پُر کیف فضاء سے کتنی پختہ محبت قائم ہو گئی ہوگی؟! اور اس ادارہ اور اپنے اکابرین کی صحبت سے جدائی برداشت کرنے میں اس کے لیے کتنی بڑی آزمائش چھپی ہوئی ہوگی!؟

اس پوری کیفیت کو بیان کرنا مشکل بھی ہے اور طویل بھی، صرف ایک ہی واقعہ نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

”جب یہ بات طے ہو گئی کہ مجھے دارالعلوم دیوبند کو الوداع کہنا ہے تو جمعہ کی نماز حسب معمول مسجد دارالعلوم (مسجد قدیم) میں پڑھا رہا تھا اور یہ تصور دل میں قائم تھا کہ شاید دارالعلوم دیوبند میں امام و خطیب کی حیثیت سے یہ آخری نماز جمعہ ہو تو شدتِ احساسِ فراق کی وجہ سے میرے جسم پر ایک لرزہ طاری تھا اور قریب تھا کہ خطبہ کے دوران اپنے آپ کو کنٹرول نہ کر سکنے کی وجہ سے منبر سے نیچے گرجاؤں، لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس مبارک منبر و محراب کی برکت سے ایک حد تک اپنے آپ کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو گیا، گرنے سے تو بچ گیا، البتہ آنکھوں سے اشکِ غم کی روانی کو روکنا میرے بس میں نہ تھا۔“ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا مندرجہ ذیل شعر میری اُس کیفیت پر صادق آ رہا ہے:

زبانِ خامہ ندارد سرّ بیانِ فراق
وگر نہ شرح دہم با تو داستانِ فراق

کراچی میں قیام اور دارالعلوم دیوبند سے مستقل رابطہ

بہر کیف! میں رمضان المبارک کے آخری دن ۱۴۱۲ھ کو دارالعلوم دیوبند سے قلبِ غمگین کے ساتھ پاکستان کے لیے روانہ ہوا، اور دل میں ایک بے چینی کی کیفیت تھی، کبھی اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتا کہ تم نے یہ صحیح فیصلہ نہیں کیا کہ اپنی مادرِ علمی سے جدائی اختیار کر رہے ہو! ادھر سے جواب ملتا کہ جب حالات ایسے بنے اور تقدیرِ خداوندی نے یہی چاہا تو اب کیا کیا جاسکتا ہے؟ حاصل یہ ہے کہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک دوسرا شعر میرے اُس ”مکالمہ نفسی“ پر صادق آ رہا تھا:

گفتم کہ خطا کردی و تدبیر نہ ایں بود
گفتا چہ توان کرد کہ تقدیر چنین بود

پھر یکا یک ایک ایسا تصور قائم ہو گیا جس سے دل کو اطمینان و تقویت حاصل ہوئی، وہ اس طرح کہ یہ فراق تو جسمانی فراق ہے جس سے روحانی تعلق میں اضافہ تو ہو سکتا ہے کمی نہیں ہو سکتی، ورنہ مدینہ منورہ کے باشندے حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ اور اپنے اُس مکان سے - جس میں انہوں نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھہرایا تھا - ہرگز جدائی کا تصور نہ کرتے، جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے مدینہ منورہ سے جسمانی فراق کو برداشت کرتے ہوئے اس کے پیغام کو لے کر ہزاروں میل دور ”قسطنطنیہ“ تک پہنچا دینے کی سعی فرمائی، یہاں تک کہ وہیں پر وفات پا کر اس کی دیوار کے ساتھ دفن بھی ہوئے، رضی اللہ عنہ وأرضاه۔

مذکورہ بالا اور اس سے ملتے جلتے صحابہ کرامؓ و اسلافِ عظامؓ کے واقعات پر غور کرتا ہوا یہ تصور قائم ہو گیا کہ دارالعلوم دیوبند صرف درو دیوار کا نام تو نہیں، یہ تو

ایک مشن اور مسلکِ حق کا نام ہے جس کی شاخیں زمین کے ہر ہر حصہ میں موجود ہیں، لہذا درودِ یوار سے جدائی دارالعلوم کے مشن سے جدائی شمار نہیں ہوگی، بلکہ اللہ سے امید ہے کہ اس ظاہری جدائی کے باوجود اپنی زندگی کی آخری رمق تک اپنی مادرِ علمی کے ساتھ روحانی رشتہ قائم رہے گا، بلکہ اس میں مزید پختگی پیدا ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کے مشن کو پھیلانے کی کوشش کروں گا۔

اسی عزم و ارادہ کے ساتھ پاکستان پہنچ کر والدہ محترمہ اور بھائیوں کے مشورہ سے کراچی میں قیام کا فیصلہ کیا جو تادمِ تحریر جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کراچی میں میری استعداد و صلاحیت سے بڑھ کر عزت و کامیابی بخشی۔ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ سید محمد یوسف بنوری ٹاؤن۔ جو پاکستان کا ایک مشہور و معروف دینی ادارہ ہے۔ میں تدریسِ حدیث اور مجلہ ”البینات“ عربی کی ادارت کا موقع ملا، نیز جامع مسجد طوبیٰ ڈیفنس۔ جو کہ پورے پاکستان کی سطح پر ایک مشہور و معروف مسجد ہے۔ میں امامت و خطابت کے ذریعہ عام مسلمانوں کی دینی خدمت کا موقع میسر ہوا۔ اس کے علاوہ اہل علم حضرات نے بے حد شفقت و ہمت افزائی کا معاملہ فرمایا اور طلبہ عزیز کے درمیان بھی اللہ تعالیٰ نے میری تمام نااہلی کے باوجود مقبولیت کی دولت سے نوازا۔ سچی بات یہ ہے کہ ان تمام نعمتوں کے حصول میں بنیادی کردار دارالعلوم دیوبند کی نسبت اور اساتذہ کرام و والدہ محترمہ کی دعاؤں نے ادا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کراچی میں رہ کر اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے مشائخ و اساتذہ کرام سے ظاہری جدائی کے باوجود رابطہ منقطع نہیں ہوا۔ ان کے ذکرِ خیر اور ایمان افروز واقعات کا تذکرہ اپنے درس و تدریس اور

بیانات و مجالس کے دوران برابر جاری رہا، اور خط و کتابت و ٹیلی فون کے ذریعہ بھی وقتاً فوقتاً رابطہ قائم رہا اور مشورہ طلب امور میں ہمیشہ مشورہ کرتا رہا۔ ان تمام رابطوں کے باوجود ظاہری جدائی سے پریشان اور دارالعلوم کے درو دیوار۔ جس کی محبت و انسیت دل میں پیوست ہو چکی تھی۔ کی زیارت اور مشائخ و اساتذہ کرام کی خدمت میں حاضری کے لیے دل تڑپتا رہا۔ ویزا حاصل کرنے کی بار بار کوشش کی، لیکن دونوں ملکوں کے تعلقات کے اتار چڑھاؤ اور ویزا قوانین میں سختی کے باعث کامیابی حاصل نہ کر سکا۔

خوابوں میں دارالعلوم دیوبند کی زیارت اور ایک لطیفہ

مجھے عام طور پر خواب کم نظر آتے ہیں، لیکن دارالعلوم دیوبند سے والہانہ تعلق اور بار بار اس کے تذکرہ کی بنیاد پر اکثر خواب کے اندر بھی اس کا احاطہ، اس کی پُرکشش و بابرکت درسگاہیں اور اساتذہ کرام نظر آتے رہتے ہیں، اور خواب ہی کے اندر اس بات پر بے حد خوشی کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے مشائخ کی زیارت سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہوں، اور بعض دفعہ زیادہ خوشی کی وجہ سے رونے کی کیفیت طاری ہوتی ہے جس سے آنکھ کھل جاتی ہے، تب پتہ چلتا ہے کہ یہ تو محض خواب ہی تھا اور دلی خواہش ہوتی ہے کہ یہ خواب شرمندہ تعبیر بن جائے۔

ایک دفعہ یہ لطیفہ پیش آیا کہ میں نے خواب دیکھا کہ: ”میں دارالعلوم دیوبند میں حاضر ہوا ہوں، اور احاطہ باغ۔ جہاں میرا کمرہ ہوا کرتا تھا۔ میں داخل ہو کر بے انتہا خوش ہو رہا ہوتا ہوں، موسم بھی بہت ہی خوشگوار اور سورج چمک رہا ہوتا ہے۔

میں اس بات پر زیادہ خوش ہوتا ہوں کہ آج اپنی مادرِ علمی کو بیداری کی حالت میں دیکھ رہا ہوں، اور اپنا جائزہ بھی لیتا ہوں کہ آج کی یہ زیارت تو بیداری کی حالت میں ہے، محض ایک خواب نہیں، پھر اپنے پرانے کمرے (احاطہ باغ کمرہ نمبر: ۱۱) کی طرف آگے بڑھتا ہوں تو وہاں پر دارالعلوم کے کوئی نئے استاذ قیام پذیر ہوتے ہیں، ان سے مل کر اس بات کا تذکرہ کرتا ہوں کہ اس کمرے میں پہلے میں رہا کرتا تھا، اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ دارالعلوم سے جدائی کے بعد ہمیشہ اُسے خواب میں دیکھا کرتا تھا، لیکن آج میری خوش قسمتی ہے کہ اُسے بیداری کی حالت میں دیکھ رہا ہوں، اور اس دوران زیادہ خوشی کی وجہ سے مجھ پر رقت طاری ہوتی ہے۔“

اُس رقت سے آنکھ کھل گئی اور دیکھا کہ رات کی تاریکی میں اپنے بستر پر شہر کراچی کے اندر پڑا ہوا ہوں، رقت تو خواب کے اندر خوشی کی وجہ سے طاری ہو ہی چکی تھی، بیداری کے بعد یادِ دارالعلوم اور غمِ فراق نے اُس رقت میں اور اضافہ کر دیا اور کچھ دیر تک اپنے بستر پر آنسو بہاتا رہا، اور حافظ کا مندرجہ ذیل شعر اپنی اس کیفیت پر منطبق پاتا رہا:

ز بہر وصل تو در حیرتم چه چارہ کنم؟
نہ در برابر چشمنہ غائب از نظری

اپنے مشائخ و اساتذہ کرام کی زیارت کے چند مواقع

دارالعلوم دیوبند سے فراق کے بعد اس کی زیارت کے اسباب تو پیدا نہیں ہو رہے تھے، البتہ دارالعلوم کے مشائخ و اساتذہ کرام سے وقتاً فوقتاً ملاقاتوں کے

کچھ مواقع دارالعلوم سے باہر ملتے رہے، جن سے درِ فراق کو وقتی طور پر کچھ ہلکا ہونے کا سہارا ملتا رہا، چنانچہ ۲۶ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ کو اپنے استاذ و مرشد فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی صدر مفتی دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۴۱۷ھ) قدس سرہ کی خدمت میں ”ڈھاکہ“ بنگلہ دیش حاضری ہوئی جہاں حضرت اپنے متعلقین کے ساتھ اعتکاف فرما رہے تھے۔ احقر کو بھی چند ہی دن اعتکاف اور حضرت فقیہ الامت قدس سرہ کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا اور مسجد چھتہ دارالعلوم دیوبند کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ حضرت فقیہ الامت کی زندگی کا آخری رمضان ہے۔ لیکن وہی ہوا جو اللہ نے مقدر فرمایا تھا، ماہ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ کو جنوبی افریقا میں سفر کے دوران حضرت کا وصال ہوا، رحمہ اللہ رحمةً واسعةً۔

اسی طرح ”ڈیڑھ سو سالہ خدمات دارالعلوم دیوبند“ کے عنوان سے ایک سہ روزہ کانفرنس بتاریخ ۱۴، ۱۵، ۱۶ / محرم الحرام ۱۴۲۲ھ مطابق ۹، ۱۰، ۱۱ / اپریل ۲۰۰۱ء جمعیت علمائے اسلام پاکستان کی طرف سے پشاور میں منعقد کی گئی تھی جس میں حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب صدر جمعیت علمائے ہند و رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم کے بڑے اساتذہ کرام کو خصوصی طور پر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس موقع پر حضرت مہتمم صاحب قدس سرہ، حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب برد اللہ مضجعہ، حضرت الاستاذ مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری دامت برکاتہم اور چند دیگر اساتذہ دارالعلوم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

اس کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب استاذ حدیث دارالعلوم

دیوبند مدظلہم چند مرتبہ کراچی تشریف لائے اور ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، بلکہ احقر کی تمنا پر ہر مرتبہ غریب خانہ کو تشریف آوری سے نوازا۔ اور ماہ شعبان ۱۴۳۳ھ کو ”جامعہ اسلامیہ لوسا کا“۔ جو افریقی ملک ”زامبیا“ میں واقع ایک دینی ادارہ ہے۔ کی طرف سے احقر کو اس کے سالانہ اختتامی پروگرام میں شرکت کی دعوت دی گئی، اور ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس پروگرام کے مہمان خصوصی استاذ محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مدظلہم ہوں گے۔ احقر کی خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہی، اور بخوشی دعوت کو قبول کر کے بتاریخ ۱۴۳۳/۸/۴ مطابق ۲۴/۶/۲۰۱۲ء کراچی سے ”زامبیا“ پہنچا، اور بتاریخ ۱۴۳۳/۸/۱۰ مطابق ۳۰/۶/۲۰۱۲ء حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد پالن پوری مدظلہم بھی تشریف لائے اور دس دن تک ان کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا، یہاں تک کہ واپسی میں بھی ”دبئی“ ایئرپورٹ تک ایک ہی جہاز میں ان کے ساتھ رہا۔ دبئی ایئرپورٹ سے وہ دہلی اور احقر کراچی روانہ ہوا اور اس سفر کا ایک بنیادی مقصد حاصل ہو گیا۔ اس سفر میں مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے استاذ محترم سے یہ درخواست کی تھی کہ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے دارالعلوم دیوبند کی زیارت اور وہاں پر آپ کے درس حدیث میں حاضری کا ایک موقع عطا فرمائیں۔

ماہ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ کو حجاز مقدس میں حج کے موقع پر بھی حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب زید مجدہم، ان کے چھوٹے بھائی جناب مولانا سید اسجد مدنی صاحب زید لطفہم، حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند مدظلہم، حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی صاحب استاذ حدیث و مدیر ”ماہنامہ

دارالعلوم دیوبند، زید مجدہم اور محترم دوست جناب مولانا عبدالخالق سنہجلی استاذ حدیث و نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند حفظہ اللہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور وہاں دارالعلوم دیوبند کی یادیں خوب تازہ ہو گئیں۔

بہر صورت! دارالعلوم دیوبند کو خیر باد کہنے کے بعد تقریباً ۲۳ سال بیت گئے اور وہاں پر جانے کی کوئی صورت کوشش کے باوجود میسر نہ آسکی، البتہ - جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے - رابطہ کا سلسلہ اور دارالعلوم سے دور مختلف مقامات پر دارالعلوم کے مشائخ و اساتذہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ بدستور قائم رہا، اور یہ دعا کرتا اور کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ وہاں پر حاضری کی کوئی صورت بھی پیدا فرمادیں۔

حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب کی طرف سے دیوبند حاضری کی دعوت

دارالعلوم دیوبند کی زیارت کے لیے بے تابی میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے دل کی آواز سن لی اور حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم صدر جمعیت علمائے ہند اور استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ”عظمت صحابہؓ کانفرنس“ - جو ۹/۵/۱۴۳۵ھ مطابق ۱۱/۳/۲۰۱۴ء کو دارالعلوم دیوبند میں منعقد ہونے والی تھی - میں شرکت کا دعوت نامہ میرے مخلص دوست جناب مولانا مفتی مظہر شاہ صاحب بہاولپوری زید لطفہم کے توسط سے موصول ہوا۔ دعوت نامہ میں پاکستان سے کل تقریباً پچیس حضرات مدعو تھے جن میں احقر کا نام بھی شامل تھا۔ مولانا مفتی مظہر شاہ صاحب نے فرمایا کہ آپ حضرات کے

پاسپورٹ ہم خود آپ سے لے کر اسلام آباد میں واقع انڈین سفارت خانہ سے ویزا لگوا کر واپس کر دیں گے اور ان شاء اللہ! کانفرنس کی مقررہ تاریخ سے پہلے ہم سب لوگ روانہ ہو کر کانفرنس میں شرکت کریں گے۔ احقر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا! اس لیے کہ ایک طرف سے دارالعلوم دیوبند کی زیارت کا موقع ملنے والا تھا اور دوسری طرف مذکورہ تاریخوں میں ششماہی امتحان کی وجہ سے اسباق موقوف ہوتے اور ان کا حرج بھی نہ ہوتا۔

چنانچہ مولانا مفتی مظہر شاہ صاحب کی معرفت سے تمام حضرات کے پاسپورٹ اسلام آباد بھیجے گئے، لیکن انڈین سفارت خانہ نے نامعلوم وجوہات کی بنیاد پر ویزا دینے میں دیر لگا دی اور کانفرنس کی مقررہ تاریخ گیارہ مارچ سے پہلے کسی کو بھی پاسپورٹ واپس نہ مل سکا، لہذا ”عظمت صحابہ“ کانفرنس“ میں شرکت کا موقع ہاتھ سے نکل گیا، البتہ ویزا کچھ تاخیر کے ساتھ سب کو مل گیا، اور حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہم نے پیغام بھیجا کہ چونکہ ویزا تو لگ گیا ہے، لہذا آپ حضرات مذکورہ کانفرنس میں نہ سہی، دارالعلوم دیوبند کی زیارت کے لیے اپنی صوابدید کے مطابق تشریف لائیں اور آپ حضرات میرے مہمان ہوں گے۔

حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم کے اس پیغام کے بعد دیگر مدعو حضرات نے تو ماہ اپریل کے شروع میں سفر کا ارادہ و انتظام فرمایا، لیکن احقر نے دو وجہ سے اپنا سفر مزید مؤخر کر دیا، ایک وجہ تو یہ تھی کہ ماہ اپریل مطابق ماہ جمادی الثانی میں ششماہی امتحان کے بعد اسباق دوبارہ زور و شور کے ساتھ جاری ہو چکے تھے اور جامعہ کے نظام کے مطابق وسطِ رجب تک سالانہ نصاب مکمل کرانا

ضروری ہوتا ہے، اور سفر کی صورت میں اسباق کا نقصان ہوتا، اور وقت مقررہ تک مناسب انداز کے ساتھ اسباق کا مکمل کرانا مشکل ہو جاتا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مجھے تقریباً ۲۳ سال بعد اپنی مادر علمی اور اپنے مشائخ و بزرگوں کی خدمت میں حاضری کا موقع نصیب ہو رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ یکسوئی کے ساتھ اپنے اساتذہ کرام و مشائخ دارالعلوم اور دوست و احباب کی زیارت کروں اور حتیٰ الامکان ہر ایک سے انفرادی طور پر ملنے کی سعادت حاصل کروں، اور یہ سب کچھ حاصل ہونا ایک بڑی جماعت کی معیت میں بظاہر مشکل نظر آ رہا تھا، لہذا احقر نے اس جماعت کے ساتھ جانے سے معذرت کر لی۔

ماہِ رجب میں اسباق کا اختتام اور دیوبند کا سفر

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے احقر نے ۲/ رجب ۱۴۳۵ھ مطابق ۴/ مئی ۲۰۱۲ء بروز اتوار اپنے اسباق ختم کرا کر دعا کرائی اور اگلے دن ۵/ رجب ۱۴۳۵ھ مطابق ۵/ مئی ۲۰۱۲ء بروز پیر بذریعہ پی. آئی. اے کراچی سے پاکستانی ٹائم کے مطابق صبح آٹھ بج کر پچپن منٹ پر دہلی کے لئے روانہ ہوا۔ تقریباً پونے دو گھنٹے میں ہندوستانی ٹائم کے مطابق گیارہ بج کر دس منٹ پر دہلی ایئرپورٹ پہنچ گیا۔ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہم کو اپنے پروگرام کی پیشگی اطلاع کر دی تھی جس پر حضرت نے ”مرحبا“ کہہ کر خوشی کا اظہار فرمایا تھا اور یہ بھی کہ مذکورہ تاریخ کو دہلی ایئرپورٹ پر آپ کا استقبال کیا جائے گا۔

دہلی ایئرپورٹ پہنچ کر مختصر وقت میں جب قانونی کارروائی سے فارغ ہو کر باہر

آیا تو جناب مولانا محمد سراج صاحب قاسمی ذمہ دار دفتر جمعیت علمائے ہند دہلی؟ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب زید مجدہم کے حکم سے حضرت ہی کی گاڑی اور ڈرائیور سمیت انتظار کر رہے تھے، اور حضرت والا چونکہ اسباق کی مصروفیت کی وجہ سے خود دیوبند میں تھے، اس لیے مولانا محمد سراج صاحب سے بذریعہ فون برابر معلوم فرماتے رہے کہ امام صاحب (احقر کو احاطہ دار العلوم دیوبند میں امام صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) پہنچے یا نہیں؟ اور جب احقر مولانا محمد سراج صاحب کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا تو اس وقت بھی حضرت والا کا فون آیا کہ کیا ہوا؟ مولانا نے جب یہ جواب دیا کہ پہنچ گئے، میرے ساتھ ہیں تو حضرت نے فرمایا کہ بات کر دیجئے۔ جب میں نے فون لیا تو حضرت والا کی مشفقانہ اور پُر اثر آواز میں ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ“ سن کر دل باغ باغ ہو گیا۔ حضرت والا نے خیریت کے ساتھ پہنچنے پر خوشی کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ آپ کا کھانا جمعیت کے دفتر میں تیار ہے، آپ ظہر پڑھ کر کھانا کھائیں، اس کے بعد آپ کی مرضی ہے، چاہیں تو آج دہلی میں آرام کریں، کل دیوبند آجائیں، چاہیں قیلولہ کر کے آج ہی آجائیں، مولانا محمد سراج صاحب گاڑی اور ڈرائیور سمیت آپ کے ساتھ ہوں گے۔ احقر نے عرض کیا کہ اب جب دیوبند جانے کی صورت بن رہی ہے تو دہلی میں آرام کیسے ملے گا؟ بہر صورت! ایئرپورٹ سے مولانا محمد سراج صاحب کے ساتھ دفتر جمعیت پہنچے۔ مولانا فضل الرحمن صاحب سیکریٹری جمعیت نے بہت اکرام کیا۔ ظہر کی نماز کے بعد کھانا کھا کر اپنی عادت کے مطابق تھوڑی دیر کے لیے قیلولہ کرنے کی غرض سے لیٹا، لیکن دیوبند کی محبت و تڑپ میں سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو رہا تھا اور بقول شاعر:

منزلِ یارِ چوں شود نزدیک
آتشِ شوق تیزتر گردد

محبت و وصال کے جذبات میں اضافہ ہو رہا تھا، لہذا اُٹھ کر مولانا محمد سراج صاحب سے عرض کیا کہ دیوبند چلنا ہے۔ موصوف کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے، فوراً تیار ہوئے اور ڈرائیور محمد یاسین صاحب اور ان کے ایک اور ساتھی اور احقر کو ساتھ لے کر دیوبند روانہ ہوئے۔ عصر کے وقت دیوبند۔ جو کہ دہلی سے تقریباً ایک سو پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ کے حدود میں داخل ہو گئے، اور یہ خیال کر کے کہ دارالعلوم پہنچتے پہنچتے کہیں عصر کی نماز میں تاخیر نہ ہو جائے اس لیے نماز پڑھنے کے لیے مین روڈ کے کنارہ پر واقع ایک مدرسہ ”جامعہ زکریا“ کی مسجد کے ساتھ رُک گئے۔ وضو کر کے احقر جیسے ہی مسجد میں داخل ہوا تو وہاں پر موجود مدرسہ کے مہتمم صاحب نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور بے حد احترام سے پیش آئے اور فرمایا کہ جب آپ دارالعلوم میں بحیثیت مدرس و امام فرائض انجام دے رہے تھے اس زمانہ میں میں پڑھتا تھا۔ انہوں نے اکرام کرنا بھی چاہا، لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے ہم نے معذرت کر لی اور نماز پڑھ کر دارالعلوم کی طرف روانہ ہو گئے۔

دارالعلوم کے قریب ”محلہ خانقاہ“ میں جب داخل ہوئے تو طلبہ عزیز حسب معمول بعد العصر چہل قدمی کے لیے گلیوں سے گزر رہے تھے اور ہر ملنے والے کو سلام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چہروں پر نور و وقار، چلنے میں سادگی اور نگاہوں کو نیچے کیے ہوئے چل رہے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ انسانوں کی شکل میں فرشتے چل رہے ہیں۔ مجھے ان کو دیکھ کر ۲۳ سال پہلے کا وہ دور یاد آ رہا تھا جب مجھ جیسا سیاہ کار بھی بعد العصر اسی سرزمین پر چہل قدمی کے لیے نکلا کرتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب زید مجدہم کے

مکان پر پہنچ گئے۔ رفیق سفر مولانا محمد سراج صاحب کا چونکہ حضرت والا سے برابر بذریعہ فون رابطہ قائم تھا، اس لیے حضرت کو یہ معلوم تھا کہ ہم پہنچنے والے ہیں اور وہ انتظار میں تھے، جیسے ہی ہم ان کے مکان میں پہنچے تو وہ بے حد شفقت و محبت سے ملے اور سبز چائے۔ جو بالعموم عصر کے بعد ان کی مجلس میں چلتی رہتی ہے۔ پیش فرمائی، اور حال و احوال پوچھنے کے بعد فرمایا کہ آپ کا قیام دارالعلوم کے مہمان خانہ میں ہوگا۔ البتہ جب تک آپ کا قیام ہوگا صبح کا ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا میرے یہاں ہوگا۔ ہاں! اگر کسی نے دعوت کی اور آپ نے قبول کر لی تو وہ آپ کی مرضی پر موقوف ہے، اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ چونکہ میرے کچھ پروگرام طے شدہ ہیں تو میں اگر کسی دن دیوبند میں نہ بھی رہا، تب بھی یہ گھر آپ کا ہے، میرے صاحبزادے (مولانا سید امجد مدنی فاضل دارالعلوم دیوبند حفظہ اللہ) آپ سے برابر رابطہ میں رہیں گے۔

مغرب کی نماز سے پہلے میرا سامان کمرہ نمبر: ۱۱ مہمان خانہ دارالعلوم دیوبند منتقل کیا گیا۔ کمرہ کافی کشادہ، آرام دہ اور ایئر کنڈیشنڈ پر مشتمل تھا۔ سامان رکھ کر کمرہ کی چابی میرے حوالہ کی گئی، اور میں دارالعلوم کی مسجد قدیم میں مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے جیسے ہی مہمان خانہ سے نکلا، اسی وقت دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ موصوف نے بہت ہی خوشی اور محبت کا اظہار فرمایا، مغرب کی نماز مسجد قدیم۔ جس کی امامت و خطابت کی ذمہ داری تقریباً دس سال تک احقر کے سپرد رہی تھی۔ ادا کی۔ مغرب کے بعد دارالعلوم کے احاطہ میں گھومتا ہوا پرانی یادیں تازہ کرتا رہا۔ کمرہ نمبر: ۱۱ ”احاطہ باغ“ جس

میں احقر کا قیام رہتا تھا وہاں بھی پہنچا، لیکن وہ کمرہ حال ہی میں جدید تعمیری نقشہ میں آکر منہدم کر دیا گیا تھا، صرف بنیادوں اور محل وقوع کی زیارت نصیب ہوئی۔ دارِ جدید کی عمارت مدنی گیٹ سے معراج گیٹ تک منہدم ہو کر نئے سہ منزلہ نقشہ کے مطابق تعمیر کی جا چکی تھی جس میں صرف ”بابِ الظاہر“ درمیان میں پرانی حالت پر باقی تھا۔ مدنی گیٹ سے احاطہ باغ تک کا حصہ بھی منہدم ہو چکا تھا، اور نئے نقشہ کے مطابق بنیادوں کی کھدائی کا کام جاری تھا۔ معراج گیٹ سے نو درہ تک کا حصہ پرانی حالت میں تھا، لیکن اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔

طویل فراق کے بعد اپنی مادرِ علمی کے احاطہ میں گھومتا ہوا بار بار یہ تسلی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آج میں حقیقتاً اپنی روحانی ماں کی آغوشِ رحمت میں پہنچ چکا ہوں، اور یہ کوئی خواب یا صرف تصور ہی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے میرے طویل فراق کو وصال سے تبدیل کر دیا ہے۔

آن پریشانی شبہائے دراز و غمِ دل
ہمہ در سایہ گیسوئی نگار آخر شد

دارالعلوم کے احاطہ میں ایک مختصر گشت کرنے کے بعد واپس حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ کر ان کے ساتھ رات کا کھانا کھایا۔ حضرت والا نے احقر کی دلجوئی کے لیے میرے بے تکلف دوست جناب مولانا عبدالخالق سنبھلی صاحب استاذِ حدیث و نائبِ مہتمم دارالعلوم دیوبند اور چند دیگر حضرات کو بھی کھانے پر مدعو کیا تھا، کھانے کے بعد دارالعلوم کی عالی شان مسجد جدید ”جامع مسجد رشید“ میں عشاء کی نماز پڑھی، اس مسجد سے بھی احقر کی یادیں وابستہ ہیں۔

جامع مسجد رشید کا تذکرہ

احقر کو اچھی طرح یاد ہے کہ بروز جمعہ ۲۳/۷/۱۴۰۶ھ مطابق ۴/۴/۱۹۸۶ء اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا جس میں دارالعلوم دیوبند کے اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب قدس سرہ، بڑے اساتذہ بالخصوص حضرت الاستاذ مرشدی مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہ اور بعض معزز مہمان جیسے حضرت حکیم عبدالرشید محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ (عرف حکیم نومیاں) اور حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے شرکت کی۔ احقر اس وقت دارالعلوم میں تدریس اور مسجد قدیم کی امامت و خطابت کی ذمہ داری انجام دے رہا تھا اور اس بابرکت تقریب میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔

جب سنگ بنیاد رکھا گیا اور اس کے بعد بنیادوں کی کھدائی اور باقاعدہ تعمیری کام کا آغاز ہوا تو حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احقر پر اعتماد کرتے ہوئے اس مسجد کی نگرانی اور تعمیری سامان کی دیکھ بھال ایک اضافی کام کے طور پر احقر کے سپرد کرنا چاہی، احقر نے کافی معذرت بھی کی اور عرض کیا کہ مجھے تدریس کے علاوہ اس جیسے کاموں کا نہ تو کوئی تجربہ ہے اور نہ ہی دلچسپی، لیکن انہوں نے اصرار فرماتے ہوئے کہا کہ یہ دارالعلوم کی خدمت ہے اور آپ پر اعتماد ہے، آپ اس کو قبول کیجئے، اور ساتھ ساتھ دارالعلوم کے لیٹر پیڈ پر احقر کے نام ایک تحریر ارسال فرمادی، جس میں سلام کے بعد مندرجہ ذیل مضمون درج تھا:

”الحمد للہ! تعمیر مسجد دارالعلوم کا کام شروع ہو گیا ہے۔ کام منظور شدہ ٹھیکیداران کے ذریعہ کرایا جا رہا ہے۔ تکنیکی نگرانی انجینئر اور آرکٹیکٹ صاحبان فرما رہے ہیں۔ مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں عمارتی سامان ادارے کی جانب سے فراہم کیا

جار رہا ہے۔ اس سلسلہ میں نگرانی کے فرائض آپ کو تفویض کیے جاتے ہیں۔ موقع پر جو سامان آئے اس کا اندراج رجسٹروں میں باقاعدہ طور پر اپنی نگرانی میں کرا کر آپ بلوں پر تصدیق فرمائیں۔ عمارتی سامان کی کوالٹی، مقدار اور تعداد کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں۔ اس امر کی جانب بھی توجہ فرمائیں کہ کوئی سامان کسی بھی صورت میں خورد برد نہ ہو سکے۔ شعبہ جات متعلقہ اس سلسلہ میں آپ سے مکمل تعاون کریں گے۔ نقولات، شعبہ جات محاسبی، دارالاقامہ، اور تعمیرات کو بغرض اطلاع اور ضروری کارروائی ارسال ہیں۔

نوٹ: اعلیٰ منزل اور دیگر زیر تعمیر کاموں کی نگرانی بھی آپ کے سپرد کی جاتی ہے۔“

مرغوب الرحمن

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۴۰۷/۸/۴ء

اس تحریر کے بعد معذرت کا راستہ بند ہو گیا اور احقر نے حسب الحکم نگرانی شروع کی، لیکن چند ہی دن کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں۔ مطالعہ میں دشواری ہو رہی ہے اور اسباق کی تیاری میں فرق محسوس ہو رہا ہے، تو میں نے حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بڑی لجاجت کے ساتھ عرض کیا کہ حضرت! آپ کے حکم کے مطابق میں نے یہ کام شروع تو کر دیا، لیکن اب مجھے پورا اندازہ ہو گیا کہ یہ میرے بس سے باہر ہے، لہذا براہ کرم اس کام سے میری معذرت منظور فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، انہوں نے میری معذرت منظور فرما کر اس کام کو جناب مولانا عبدالخالق صاحب مدرسی (موجودہ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند) کے سپرد کر دیا، جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیت، مسلسل محنت اور ذاتی دلچسپی کی بنیاد پر ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۰۰۳ء تک بحسن و خوبی پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔

کچھ تذکرہ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب کے بارے میں

حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہم العالی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کے صاحبزادے، دارالعلوم دیوبند کے استاذِ حدیث اور جمعیت علمائے ہند کے صدر ہیں۔ حضرت والا سے احقر کو پڑھنے کی سعادت میسر نہ ہو سکی، اس لیے کہ جس وقت حضرت والا کو مدرسہ شاہی مراد آباد سے استاذِ حدیث کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند بلایا گیا اس وقت احقر دارالعلوم سے فارغ ہو کر مدرس بھی بن گیا تھا، البتہ حضرت کو قریب سے دیکھنے کا موقع خوب ملا، ان کی عظمت و ہمت، تقویٰ و طہارت، سخاوت و تواضع، ذہانت و صلاحیت، شجاعت و بلند اخلاق اور بااثر شخصیت کا ہمیشہ معترف و معتقد رہا، اور استاذ ہی کی طرح ان کا احترام میرے دل میں جاگزیں رہا۔

علمی و انتظامی صلاحیت

حضرت والا نے دارالعلوم میں استاذِ حدیث ہونے کے ساتھ ساتھ نظامتِ تعلیمات کا عہدہ بھی ایک عرصہ تک سنبھالا، اور تعلیم و تربیت کی بہتری کے لیے مؤثر اقدامات کیے۔ فجر کی نماز کے لیے اذان کے بعد ہی ٹارچ لے کر پورے دارالعلوم

کے طلبہ کو جگانا آپ کا معمول تھا، چنانچہ نماز شروع ہونے سے پہلے پوری مسجد طلبہ سے بھر جاتی تھی۔ علمی قابلیت کے ثبوت کے لیے دارالعلوم دیوبند میں حدیث پڑھانا اور نظامتِ تعلیمات کا عہدہ سنبھالنا ہی کافی ہے۔ اس کے علاوہ علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۵۵ھ) کی ۲۳ جلدوں پر مشتمل مایہ ناز تصنیف ”نخب الأفكار فی تنقیح مبانی الأخبار“ جو امام ابو جعفر احمد بن محمد طحاوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۲۱ھ) کی مشہور کتاب ”شرح معانی الآثار“ کی شرح ہے اور حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہم کی محنت و تحقیق کے بعد زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اہل علم کے لیے ایک بہترین علمی تحفہ ثابت ہوئی تو یہ حضرت والا کی اعلیٰ قابلیت و صلاحیت کا شاہدِ عدل ہے۔

سفر و حضر میں تہجد کی پابندی

تقویٰ کا یہ عالم ہے کہ احقر کے علم کے مطابق سفر و حضر میں تہجد اور قبولیت کی گھڑیوں میں اللہ تعالیٰ کو پکارنے کا معمول برابر قائم رہتا ہے، اس سلسلہ کا ایک چشم دید واقعہ قلمبند کرتا ہوں:

”شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ کے ایک داماد جناب بھائی نعیم صاحب خانجہا پوری ہر سال آم کے موسم میں حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہم اور مدنی خاندان کے دوسرے افراد و چند متعلقین کی ایک پر تکلف دعوت کیا کرتے تھے، جس میں بہترین کھانے کے ساتھ ساتھ اپنے باغ کے ذائقہ دار آم بھی کھلاتے تھے۔ اس دعوت میں اکثر احقر کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ رات کا قیام ان کے کشادہ مکان میں مہمانوں کے لیے مختص حصہ میں ہوا کرتا تھا، جس میں چند کمروں کے

ساتھ ایک کشادہ برآمدہ بھی تھا۔ ایک مرتبہ آم کے موسم میں حسب معمول بھائی نعیم صاحب نے دعوت کی اور بروز اتوار ۲۱ ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۵ جولائی ۱۹۹۰ء حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب زید مجدہم، ان کے چند متعلقین اور احقر خانجہا پور پہنچے۔ رات کو کھانا اور آم کھانے کے بعد جب ہم سب آرام کے لیے مہمان خانہ میں لیٹ گئے تو تہجد کے وقت احقر نے اپنے بستر پر لیٹے لیٹے دیکھا کہ حضرت والا آہستہ آہستہ اٹھ کر مکان کے دوسرے حصہ میں وضو کر کے آرام کرنے والوں سے ذرا دور ہو کر برآمدے کے ایک کونے میں نماز تہجد میں مصروف ہو گئے، اور اتنی بلند آواز سے تلاوت کرتے رہے کہ سونے والوں کی نیند میں فرق نہ آنے پائے، میری آنکھیں چونکہ پہلے ہی کھل چکی تھیں اور حضرت کے اس قابل رشک عمل کے تجسس میں کانوں سمیت لگی ہوئی تھیں، اس لیے مجھ سے یہ عمل پوشیدہ نہ رہ سکا، البتہ تجاہل عارفانہ اختیار کرتا ہوا حضرت والا کو یہ نہیں محسوس ہونے دیا کہ میں وضو سے لے کر با اثر تلاوت قرآن تک پورے اس عمل خیر کا رشک کے ساتھ جائزہ لے رہا ہوں۔ اُس وقت تو یہ بھی میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ کونسی سورت و پارہ پڑھ رہے تھے، البتہ اب وہ یاد نہیں رہا، یہ ضرور یاد ہے کہ کافی لمبی تلاوت فرمائی اور آخر میں دعا پراپنا معمول پورا کیا۔“

مولینا کی ہمت و شجاعت اور ایک اہم واقعہ

ہمت و شجاعت سے متعلق ان کا یہ واقعہ میں بھول نہیں سکتا کہ ۲۱ دسمبر ۱۹۸۳ھ مطابق ۱۵ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ بروز بدھ دس تا بارہ افراد پر مشتمل ایک شرپسند ٹولے (جن کا اپنی شرارتوں کی وجہ سے دارالعلوم سے اخراج ہو گیا تھا) نے دارالعلوم پر قبضہ کرنے کے لیے ظہر کی نماز کے بعد مسلح حملہ کر دیا، اور جنوبی دروازہ سے فائرنگ کرتے ہوئے داخل ہو گئے اور پورے دارالعلوم میں سخت خوف و

ہر اس پھیلا دیا، اس موقع پر شیخ الاسلام کے بہادر صاحبزادے حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب اپنی لائسنس یافتہ بندوق کے ساتھ اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر شریکوں کے مقابلہ کے لیے دارالعلوم میں داخل ہوئے اور جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدیر ماہنامہ دارالعلوم کے ساتھ مل کر ان مسلح افراد کا مقابلہ شروع کیا، ان کو دیکھ کر نہتے طلبہ کی جان میں جان آگئی اور ان کا ساتھ دیا اور بحمد اللہ مختصر وقت میں وہ ٹولہ پسپا ہوا، کچھ تو بھاگ گئے اور کچھ پکڑے گئے جن کی زبردست دھلائی ہوئی اور پھر حضرت والا اور چند دیگر اساتذہ نے ان کی جانیں بچائیں، ورنہ دارالعلوم کے مشتعل طلبہ شاید ان کو زندہ نہ چھوڑتے۔

اس موجودہ سفر میں بھی احقر نے ایک سے زائد مرتبہ دیکھا کہ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب صبح ترمذی شریف کا سبق پڑھا کر جمعیت علمائے ہند کی طرف سے مختلف مقامات پر طے شدہ پروگراموں میں شرکت کر کے تقریر فرماتے ہیں، رات کو دہلی پہنچ کر نماز و کھانے سے فارغ ہو کر کچھ آرام کرتے ہیں، رات کے آخری حصہ میں اٹھ کر تہجد کا اپنا مستقل معمول پورا کرتے ہیں اور پھر دہلی سے روانہ ہو کر صبح دیوبند پہنچ کر اپنا سبق پڑھاتے ہیں۔ ایک اور خاص بات جو احقر نے واضح طور پر محسوس کی، یہ تھی کہ بڑھاپے اور اتنی مصروفیات کے باوجود نہ تو ان کے چہرہ پر تھکاوٹ۔ آٹار محسوس ہوتے تھے اور نہ ہی اندازِ گفتگو میں کوئی فرق، بلکہ ہشاش بشاش چہرہ کے ساتھ ہر ایک سے ملنا اور ہر ملنے والے سے نہایت اطمینان و اپنائیت کے ساتھ گفتگو اور مزاج پرسی کا سلسلہ برقرار رہتا تھا۔ اتنی مصروفیات و بڑھاپے کے باوجود اپنے اعصاب و حواس پر اتنا کنٹرول اور اپنی زبان کی شیرینی و نرمی کو اس حد تک قابو میں رکھنا کم از کم احقر نے تو اپنی زندگی میں نہیں دیکھا ہے، اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے علاوہ اپنے اکابرین میں سے کسی سے متعلق سنا بھی نہیں ہے۔

مسلمانانِ ہند کے مسائل سے گہری دلچسپی

مسلمانانِ ہند کے عمومی مسائل کے حل کے لیے حضرت والا کی سرگرمیوں اور دلچسپی سے متعلق ایک واقعہ جو اس سفر کے دوران میرے علم میں آیا، نمونہ کے طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ کچھ انتہاء پسند ہندوؤں نے پانچ تاسات بے گناہ مسلمان افراد پر گجرات میں ”اکثر دھام“ حملہ کا الزام لگا کر مقدمہ قائم کر دیا، جس کے بعد ہائی کورٹ گجرات نے ان کو پھانسی کی سزا سنائی۔ جمعیت علمائے ہند نے حضرت مولانا مدظلہم کی سرکردگی میں اس فیصلہ کو سپریم کورٹ آف انڈیا میں چیلنج کیا اور مقدمہ کی مکمل پیروی کی۔ اللہ کے فضل و کرم اور حضرت کی ذاتی دلچسپی کے باعث سپریم کورٹ نے اپنے اصولی فیصلہ کے تحت ہائی کورٹ کی سزا کو کالعدم قرار دے کر ان بے گناہ افراد کو باعزت بری کر دیا۔ اس کے بعد جمعیت نے بروز منگل ۲۰/۵/۲۰۱۴ء کو دہلی میں مذکورہ بری شدہ افراد کی موجودگی میں ایک پریس کانفرنس منعقد کی جس میں حضرت مولانا نے خطاب کیا اور حقائق بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان بے گناہ افراد کو غیر قانونی طریقہ سے ملوث قرار دینے والے افسران کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مطالبہ بھی کیا۔ اس واقعہ سے مسلمانانِ ہند کے عمومی مسائل سے متعلق حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب کی بے انتہاء ذاتی دلچسپی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہم کی خدمت

میں حاضری اور ان کا ذکر خیر

جامع مسجد رشید میں نمازِ عشاء ادا کرنے کے بعد چونکہ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا

اور نہ ہی مناسب تھا کہ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہم شیخ

الحدیث و صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی ملاقات کے لیے کل کا انتظار کروں۔
 عشاء کی نماز کے بعد ہی حضرت کی خدمت میں ان کے ذاتی مکان پر۔ جو دارالعلوم
 سے آٹھ دس منٹ کے فاصلے پر واقع ہے۔ حاضری دی۔ حضرت الاستاذ سے احقر
 کو بے انتہاء محبت و عقیدت ہے، اس لیے کہ احقر نے اپنی تعلیمی زندگی میں سب
 سے زیادہ استفادہ ان ہی سے کیا ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس سال
 (تعلیمی سال ۱۴۰۱ھ-۱۴۰۲ھ) احقر نے دارالعلوم دیوبند میں دورہ حدیث کیا،
 اس سال حضرت والا نے مندرجہ ذیل تمام کتابیں پڑھائیں:

بخاری شریف جلد ثانی ترمذی شریف جلد اول سنن ابوداؤد
 صحیح مسلم (چند اسباق کے علاوہ) مؤطا امام مالک مؤطا امام محمد
 شامل ترمذی

اور اگلے سال جب احقر نے شعبہ افتاء (تخصص فی الفقہ) میں داخلہ لیا تو
 اس سال بھی حضرت والا سے خارجی طور پر کافی استفادہ کیا اور سب سے بڑھ کر
 حضرت والا کی ایک خصوصی شفقت و عنایت یہ رہی کہ جب احقر کا مدرس کی حیثیت
 سے دارالعلوم میں تقرر ہوا اور ایک دو سال پڑھانے کے بعد شدت کے ساتھ یہ
 احساس ہونے لگا کہ کاش! میں حافظ قرآن ہوتا! اس لیے کہ مدرس کے لیے حافظ
 قرآن ہونا نہایت اہم ہے اور ویسے بھی یہ ایک عظیم نعمت ہے جس سے میں محروم
 ہوں، چنانچہ حضرت والا ہی کے مشورہ سے تدریس کے ساتھ ساتھ حفظ قرآن ان
 ہی کے پاس شروع کیا اور ان کی صحیح رہنمائی، فیض و برکت اور خصوصی عنایت سے
 تقریباً ایک سال کے اندر حفظ قرآن مکمل ہو گیا، اس کے علاوہ جب تک دارالعلوم

میں تدریس کا سلسلہ رہا تو قدم قدم پر ان کی رہنمائی و سرپرستی حاصل رہی۔ دارالعلوم سے کراچی منتقل ہونے کے بعد بھی آج تک ان سے علمی اور دیگر اہم و مشورہ طلب امور میں استفادہ کا سلسلہ ٹیلی فون، خط و کتابت اور ان کی تصانیف کے ذریعہ قائم ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک حقیقی بیٹے کو اپنے مشفق والد کی طرف سے اس سے زیادہ شفقت و ذرہ نوازی کی سعادت حاصل نہیں رہی ہوگی جتنی شفقت سے حضرت الاستاذ نے اس نالائق شاگرد کو نوازا ہے اور آج تک نوازرہے ہیں۔

اللّٰهُم بَارِكْ فِي حَيَاتِهِ مَعَ الصَّحَّةِ وَالْعَافِيَةِ -

حضرت مفتی صاحب مدظلہم العالی کا ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹۷۳ء کو دارالعلوم دیوبند میں تقرر ہوا، انہوں نے دارالعلوم کی اس خدمت کو سعادت سمجھ کر اپنی تمام صلاحیتوں کو تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور اصلاح طلبہ پر لگایا۔ معاشی دشواریاں بھی پیش آئیں، لیکن انہوں نے صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے اپنے علمی کاموں میں ان دشواریوں کو حائل نہیں ہونے دیا اور نہ ہی کسی غیر علمی مصروفیت کی طرف متوجہ ہوئے۔ مفتی صاحب کی خداداد صلاحیتوں، طلبہ میں بے پناہ مقبولیت اور علمی یکسوئی کو دیکھ کر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے شیخ الحدیث و صدر المدرسین کے باوقار و اعلیٰ علمی منصب پر فائز کر دیا۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت الاستاذ دامت برکاتہم سے خوب کام لیا۔ آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ (متوفی ۱۱۷۶ھ) کی مشہور و معروف کتاب ”حجة الله البالغة“ کی شرح ”رحمة الله الواسعة“ کے نام سے پانچ ضخیم جلدوں میں تحریر فرمائی جس نے علمی حلقوں میں بڑی مقبولیت

حاصل کر لی، یہاں تک کہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۳، ۱۴، ۱۵ صفر ۱۴۲۵ھ نے اس کتاب سے متعلق ایک تحریری تجویز پاس کی جس میں حضرت مفتی صاحب کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے ان کو پوری جماعت کی طرف سے شکریہ و تحسین کا مستحق قرار دیا ہے۔ اسی طرح آپ نے ”تحفة الأملی شرح سنن الترمذی“ کے نام سے سنن ترمذی کی اردو شرح تحریر فرمائی جو آٹھ ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے، اور چونکہ اردو زبان میں ترمذی شریف کی یہ پہلی مکمل شرح ہے جس میں پوری کتاب بشمول ”کتاب العلل“ و ”شامل ترمذی“ کی تشریح کی گئی ہے، اس لیے اساتذہ کرام اور طلبہ عزیز کے درمیان اس کی خوب پذیرائی ہوئی، ”تحفة الأملی“ کی تکمیل کے بعد حضرت الاستاذ نے بخاری شریف کی شرح ”تحفة القاری“ کے نام سے لکھنا شروع فرمائی جس کی تادم تحریر گیارہ جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں، اور بارہویں و آخری جلد کا کام جاری ہے۔ (۱) اللہ تعالیٰ حضرت والا کو صحت و عافیت کے ساتھ اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ مذکورہ تصانیف کے علاوہ حضرت الاستاذ مدظلہم نے دیگر بھی متعدد تصانیف تحریر فرمائی ہیں جو مقبول عام و خاص بن چکی ہیں۔

حضرت الاستاذ کی قناعت و استغناء

تقویٰ و طہارت، اخلاص و للہیت اور قناعت و استغناء میں حضرت الاستاذ مدظلہم نے اکابر کی یاد کو تازہ کر دیا ہے۔ ۱۳۹۳ھ کو جب دارالعلوم دیوبند میں ایک معمولی مشاہرہ پر ان کا تقرر عمل میں آیا تو صبر و قناعت کے ساتھ اس پر اکتفا کرتے

(۱) الحمد للہ بارہویں اور آخری جلد بھی ماہِ رجب ۱۴۳۱ھ کو شائع ہو کر منظرِ عام پر آ گئی۔

ہوئے دارالعلوم کی خدمت کو جاری رکھا، یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی تصانیف کو خوب مقبولیت عطا کی اور اپنے ذاتی کتب خانہ ”مکتبہ حجاز“ سے بقدر ضرورت ایک آمدنی کا سلسلہ بن گیا تو انہوں نے ۱۴۲۳ھ کو حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد دارالعلوم دیوبند سے تنخواہ لینے کا سلسلہ موقوف کر دیا اور جو تنخواہ ۱۳۹۳ھ سے ۱۴۲۳ھ تک وصول فرما چکے تھے وہ بھی واپس لوٹا دی، بلکہ دارالعلوم دیوبند میں تقرری سے قبل ”دارالعلوم اشرفیہ“ راندر میں جو نو سال تک ایک مقررہ مشاہرہ پر تدریسی خدمت انجام دے چکے تھے، ان نو سالوں کی تنخواہ بھی دارالعلوم اشرفیہ کو لوٹا دی۔

بہر حال! اس مختصر سفر کے موقع پر جب پہلے ہی دن عشاء کے بعد حضرت والا دامت برکاتہم کی خدمت میں حاضری ہوئی تو انہوں نے بڑی شفقت و خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ: جب تک تم دیوبند میں ہو دو پہر کا کھانا ظہر کے بعد اور رات کا کھانا عشاء کے بعد میرے ساتھ کھانا، تاکہ کھانے کے بہانے ملاقات ہوتی رہے اور روزانہ عصر سے مغرب تک بھی میرے پاس رہنا۔ احقر نے کھانے سے متعلق تو اس لیے معذرت کر دی کہ کھانے کی بات پہلے ہی حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہم سے ہو چکی تھی، البتہ عصر کے بعد حاضری کی اجازت کو اپنے لیے نعمتِ عظمیٰ تصور کرتا ہوں اور روزانہ حاضری کا عزم ظاہر کر دیا، چنانچہ روزانہ بعد العصر حضرت الاستاذ کی مجلس میں حاضر ہوتا رہا اور ان کے علمی و اصلاحی ملفوظات سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مزید برآں! ۶/ رجب بروز منگل حضرت والا کے درسِ بخاری شریف میں بھی شرکت کی سعادت نصیب ہوئی جو حضرت نے ”کتاب

الشروط“ کے اندر ”باب الشروط في المهر عند عقدة النكاح“
(ج: ۱، ص: ۳۷۶) سے پڑھایا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی ہر مجلس و درس میں
شرکت کے موقع پر مندرجہ ذیل شعر میں بیان کردہ حقیقت سامنے آتی رہی:

صحبتِ نیکان اگر یک ساعت است
بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

حضرت الاستاذ سے خصوصی اجازتِ حدیث کی درخواست

اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ احقر نے حضرت مفتی سعید احمد صاحب
پالن پوری مدظلہم العالی کے پاس حدیث کی کئی اہم کتابیں پڑھنے کی سعادت
حاصل کی ہے، مزید یہ بھی کہ دارالعلوم دیوبند سے احقر کی سندِ فراغت پر بھی آپ
اور دیگر اساتذہ کرام کے دستخط موجود ہیں جو اجازتِ حدیث کے لیے کافی ہیں،
تاہم میری ایک قلبی خواہش ضرور تھی کہ حضرت الاستاذ ایک خصوصی مختصر اجازت
نامہ تحریری طور پر مزید عنایت فرمادیں جس میں ان کی تمام مرویات کی اجازت
شامل ہو، چنانچہ اس سفر میں ایک دن میں نے اس درخواست کی جسارت کر ہی
دی، حضرت نے فرمایا کہ ضرور دیں گے۔ میرا خیال یہی تھا کہ حضرت الاستاذ سادہ
کاغذ پر مختصر الفاظ میں تین چار سطر تحریر فرما کر عنایت فرمائیں گے اور وہی مختصر تحریر
میرے لیے عظیم سعادت ہوگی، لیکن میری حیرت کی انتہاء نہ رہی بلکہ میرا سر شرم
سے جھک گیا جب اگلے دن بعد العصر ان کی خدمت میں حاضری ہوئی تو معلوم ہوا
کہ انہوں نے ایک مفصل اجازت نامہ تحریر فرما کر ایک خوبصورت کاغذ پر جس کے
حواشی پر رنگارنگ پھولوں کے نقوش چھپے ہوئے ہیں کاتب سے منتقل کروا دیا ہے

اور نیچے دستخط فرما کر اس کمترین شاگرد کو عنایت فرمائیں گے۔

اس اجازت نامہ میں حضرت الاستاذ (أَمَدَّ اللهُ فِي عَمْرِهِ وَصَحْتِهِ وَجْهَهُ) نے اس حقیر خادم کا جس انداز پر ذکر فرمایا ہے، احقر اس کو اپنے لیے نیک فال ضرور سمجھتا ہے، لیکن اپنے آپ کو اس کا مستحق ہرگز نہیں سمجھتا، بلکہ یہ تصور کرتا ہے کہ حضرت والا نے اپنے انداز سے اپنے ایک ادنیٰ شاگرد کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہوئے اس کی ہمت افزائی اور ذرّہ نوازی فرمائی ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

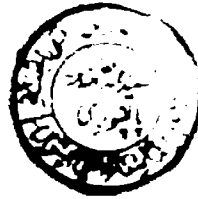
الحمد لله الذي هدانا لهذا الدين الإسلام والإهداء، والصلاة والسلام على خير خلقه
سيد المرسلين وعلى آله وصحبه ذوى الداراية واليقين، أما بعد: فإن تلميذاً
الرأس زميل اليوم، الأستاذ الأديب الأريب، الشيخ المحدث، النبیه الكريم،
العلاقة حبیبی عبد الرؤوف خن الغزنوی الأقفاني مدرس الحديث الشريف
بجامعة الإسلامية بنوري تاون بکراشي (الباكستان) قرأ على عديد من الكتب
لحديثية، كصحيح البخاري، وصحيح مسلم، والجامع للإمام الترمذي وغيرها،
وكان التصدي للإقراء هو الإجازة، ولكنه استجاز مني مرة أخرى، لحسن ظنه بي،
ولست بأهل لذلك، فما كل بيضاء شحمة، ولا كل ذات ورم سمينة، ولكن حسن
ظنه هو غاية آمالي، فاقتداء بالسلف الصالح أجزئة برواية جميع الكتب الحديثية
معروفة الأسانيد لدى تلاميذي، مثل الصحيحين، والسنن الأربعة، وغير
معاني الآثار، والموططين للإمامين الهمامين: مالك ومحمد، ومسنند الإمام
الأعظم، ومسنند الإمام أحمد بن حنبل رحمهم الله، وأدعو الله تعالى أن يوفقه
ويرضى، ويذايقه حلوة العلم والمعرفة والتحقيق، ويبلغه غاية ما يتمناه.
وأوصيه بتقوى الله تعالى في السر والعلن، وأن يتبع سنة سيد المرسلين،
وأرجو منه أن لا ينساني في دعواته الصالحة، ويوفقني وإياه لمرضاته ولصالح
الاعمال، فإنه ولي التوفيق، والحمد لله رب العالمين، وصلى الله على سيدنا
سيد الأنبياء والمرسلين. وعلى آله وصحبه أجمعين، آمين يا رب العالمين

أجازة العبد الفقير الحقير

سهر

١٠ / ٧ / ١٤٣٥ هـ

١٠ / ٥ / ٢٠١٤ م



حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب کی خدمت میں حاضری اور ان کا ذکرِ خیر

دارالعلوم دیوبند میں احقر کے اساتذہ کرام میں سے تین حضرات بقیدِ حیات ہیں (اللّٰهُمَّ بَارِكْ فِي حَيَاتِهِمْ وَصَحَّتِهِمْ وَجَهْدِهِمْ) ایک حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم جن کا تذکرہ خیر ہو چکا ہے، دوسرے حضرت الاستاذ مولانا قمر الدین صاحب مدظلہم العالی جن کا ذکرِ خیر آ رہا ہے اور تیسرے حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری زید مجدہم ہیں۔

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری سے احقر نے سنن ابن ماجہ پڑھی ہے۔ اللہ نے ان کو گونا گوں صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ تقویٰ و طہارت کے ساتھ ساتھ ذہانت و فطانت، فصاحت و بلاغت، شعر گوئی و بذلہ سنجی اور معاملہ فہمی و حاضر جوابی میں ثانی نہیں رکھتے۔ تدریس کے دوران مختصر مگر جامع و نہایت سہل انداز میں موضوع پیش کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ مضمون نگاری و تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی قدرت نے ان کو خوب صلاحیت عطا کی ہے۔ ۱۳۹۱ھ کو دارالعلوم دیوبند میں مدرس کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا اور ابتدائی درجات سے لے کر دورہ حدیث و تکمیلات تک کی کتابیں کامیابی کے ساتھ پڑھائیں، آج کل دورہ حدیث

کی ایک اہم کتاب ترمذی شریف جلد اول پڑھا رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کا مشہور و معروف ترانہ (یہ علم و ہنر کا گہوارہ۔۔۔۔۔) آپ ہی کی تخلیق اور آپ ہی کی پاکیزہ شاعری کا ترجمان ہے، جسے سن کر دلوں پر رقت طاری ہوتی ہے اور آنکھوں کو آنسو بہائے بغیر چین نہیں آتا۔ ”نغمہٴ سحر“ کے نام سے آپ کے اشعار کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

تصنیف و تالیف کی صلاحیت

تصنیف و تالیف کے میدان میں آپ کی ایک شاہکار تصنیف ”شوریٰ کی شرعی حیثیت“ ہے، جو اپنے موضوع پر ایک مفصل و مدلل کتاب ہے۔ یہ کتاب مجلس شوریٰ اور مہتمم کی باہمی حیثیت سے متعلق لکھی گئی ہے اور نصوص شرعیہ اور اسلاف امت و اکابرین دارالعلوم دیوبند کی تصریحات کی روشنی میں شوریٰ کی بالادستی، مہتمم کو اس کے سامنے جواب دہ ہونا اور مجلس شوریٰ کا مہتمم کے نصب و عزل کا مختار ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۴۰۸ھ کو پہلی بار ۴۰۸ صفحات پر مشتمل ”شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند“ کی طرف سے شائع ہوئی اور اس کو علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی و شہرت ملی۔ مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہ، حضرت مولانا معراج الحق صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری موجودہ صدر المدرسین و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مدظلہم اور مشہور مصنف حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نگران

اعزازی ”شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند“، ان تمام اکابر نے اس کتاب پر اعتماد کا اظہار فرماتے ہوئے اس پر تصدیقات ثبت فرمادی ہیں۔

میدانِ تصنیف و تالیف میں ان کا دوسرا عظیم کارنامہ ”ایضاح البخاری“ شرح صحیح بخاری ہے جس میں انہوں نے اپنے استاذِ محترم فخر الاسلام حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۹۲ھ) کے افادات کو اپنی مزید تحقیق، حسن ترتیب اور حوالوں کی نشاندہی کے ساتھ جمع فرمایا ہے اور اب تک اس کی آٹھ جلدیں (کتاب الوجی سے کتاب الاعتکاف کے اختتام تک) شائع ہو چکی ہیں اور آگے کا کام جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

مولانا کی تحریر کی خصوصیات

خوش نویسی، زود نویسی، باریک نویسی اور صاف نویسی ان چاروں عناصر کا مجموعہ میں نے اپنی زندگی میں صرف انہی کی تحریروں میں دیکھا ہے، جب قلم ہاتھ میں لیتے ہیں تو روانی کے ساتھ خوبصورت چھوٹے حروف کے ساتھ موتیوں کی لڑیاں پرونے لگتے ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی کی تحریر میں خوش نویسی ہے تو زود نویسی اور باریک نویسی معدوم، اور زود نویسی یا باریک نویسی اگر موجود ہے تو صاف نویسی اور خوش نویسی ندارد، حضرت الاستاذ مدظلہم کی تحریروں میں بیک وقت یہ تمام اوصاف نظر آتے ہیں، کاغذ کے چھوٹے سے ٹکڑے پر ایک پورے مضمون کا خلاصہ لکھنا آپ ہی کی خصوصیت ہے۔ آپ کی تحریر چاہے چند ہی سطروں پر مشتمل ہو اور صرف ایک وقتی ضرورت کے تحت لکھی گئی ہو اگر کسی صاحب

ذوق کے ہاتھ لگ جاتی ہے تو اس کی ظاہری و باطنی خوبصورتی کی وجہ سے وہ ہمیشہ اس کی حفاظت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ صاحبِ ذوق کو تو چھوڑیے! احقر جیسے مغفل طالب علم نے بھی آپ کی ہر تحریر کی حفاظت کی ہے، چنانچہ آپ کے زمانہ نظامتِ تعلیمات میں کسی سبق کے رد و بدل یا اضافہ و کمی یا دیگر تعلیمی امور سے متعلق جو وقتی حکم یا اطلاع کے طور پر آپ کی مختصر تحریریں احقر کے نام لکھی گئی ہیں وہ سب آج تک احقر کی خصوصی فائل میں محفوظ ہیں، اور بالخصوص وہ خطوط جو آپ نے اس ادنیٰ شاگرد کے خطوط کے جوابات میں لکھے ہیں، وہ تو کُل البصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تمام تحریروں کو موقع بموقع کھول کر ان سے استفادہ اور اپنے استاذ محترم مدظلہم کی یادوں کو تازہ کرتا رہتا ہوں۔ آپ نے ایک عرصہ تک ناظم تعلیمات کی حیثیت سے بھی دارالعلوم دیوبند کی خدمت کی، اس دوران آپ کا معاملہ اساتذہ کے ساتھ ہو یا طلبہ کے ساتھ نہایت موزوں و مناسب ہوا کرتا تھا، کسی استاذ یا طالب علم کو ایسی شکایت کا موقع نہیں دیا کرتے جسے ”شکایتِ بجا“ کہا جاسکے، اسی طرح کچھ عرصہ تک تدریس کے ساتھ ساتھ ”ماہنامہ دارالعلوم“ کی ادارت کی ذمہ داری بھی کامیابی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان کے حق میں ”جمع الکمالات“ کا لفظ استعمال کرنا مبالغہ سے بالکل خالی تصور کیا جانا چاہیے۔

تواضع و خاکساری

مذکورہ تمام کمالات کے ساتھ ساتھ حضرت الاستاذ کا ایک امتیازی اور خصوصی کمال ان کی حقیقی تواضع اور بے پناہ خاکساری ہے جس سے احقر بے حد متاثر ہوا ہے، اس لیے کہ ظاہری تواضع کی مثالیں تو کافی ملتی ہیں، لیکن حقیقی تواضع اور وہ بھی

صاحبِ کمال بلکہ مجمع الکمالات شخص کے اندر پایا جانا بہت مشکل ہے۔ رواں ہجری صدی کے شروع میں جب راقم داخلہ کی غرض سے دارالعلوم دیوبند پہنچا اور حضرت والا سے پڑھنے کا موقع نصیب ہوا، اور ساتھ ساتھ آپ کو بحیثیت ناظم تعلیمات بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اور دارالعلوم دیوبند سے میری جدائی کے بعد بھی آپ سے تعلق قائم رہا جو آج تک بحمد اللہ باقی ہے۔ اس طویل واقفیت کے بعد میں شرح صدر کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ تواضع کے جس مقام پر وہ فائز ہیں وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ظاہری تواضع کرنے والوں کی تواضع کا اس وقت پتہ چلتا ہے جب ان کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کو نظر انداز کیا جا رہا ہے، یا یہ کہ ان کے ہم پلہ اور کم درجہ کے لوگوں کو فوقیت دی جا رہی ہے، یا ان کے ساتھ ان کے مقام سے کم درجہ کا برتاؤ کیا جا رہا ہے، تو اس وقت وہ سیخ پا ہونے لگتے ہیں اور مختلف طریقوں سے احتجاج کرنے پر اتر آتے ہیں اور تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لا کر اپنا مقام حاصل کرنے بلکہ اس سے بھی اوپر جانے کی کوشش کرتے ہیں، البتہ کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ تو اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے آپ کو ملے ہوئے مقام سے بالاتر سمجھتے ہیں، بلکہ ملے ہوئے مقام کو اپنی حیثیت سے بالاتر سمجھ کر اللہ کا شکر بجالاتے ہیں، یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے بارے میں حدیث میں فرمایا گیا ہے: ”من تواضع لله رفعه الله“ (جس نے اللہ کی رضا کے لیے تواضع اختیار کی اللہ اس کو بلندی عطا فرماتا ہے)۔

دارالعلوم دیوبند نے ماضی میں بھی ایسے بے شمار اللہ والے پیدا کیے ہیں اور اب بھی بحمد اللہ اس کے ماحول میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں سے ایک حضرت ممدوح بھی ہیں، نمونہ کے طور پر ان کی حقیقی تواضع سے متعلق چند واقعات قلمبند کیے جا رہے ہیں:

پہلا واقعہ:

حضرت مولانا ریاست علی صاحب دامت برکاتہم سے احقر غائبانہ طور پر اس وقت سے واقف ہو چکا تھا جب وہ تعلیمی سال ۱۴۰۰ھ-۱۴۰۱ھ کو مدرسہ امینیہ دہلی میں درجہ موقوف علیہ کا طالب علم تھا، البتہ زیارت کا موقع نہیں مل سکا تھا، اور جب اگلے تعلیمی سال ۱۴۰۱ھ-۱۴۰۲ھ کو دورہ حدیث میں داخلہ لینے کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند حاضری ہوئی تو داخلہ کے ایام میں ہی ایک نورانی چہرہ والے ادھیڑ عمر کے شخص کو دارالعلوم میں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا جن کے سادہ لباس، بلا تکلف نقل و حرکت اور ہر ملنے والے کو سلام میں سبقت کرنے سے دل دل میں متاثر ہونے لگا تھا، اندازہ یہ تھا کہ یہ شخص دارالعلوم کے عام متعلقین میں سے کوئی ہوں گے جن پر بزرگوں کا رنگ چڑھا ہوا ہے، ان کی سادگی کو دیکھ کر یہ خیال ہرگز نہ تھا کہ یہ دارالعلوم کے بڑے استاذ ہوں گے، بعد میں پتہ چلا کہ یہی حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری مدظلہم ہیں۔

دوسرا واقعہ:

ایک دفعہ دارالحدیث تحتانی دارالعلوم دیوبند میں ایک جلسہ (جلسہ انعامیہ یا کوئی اور جلسہ) منعقد ہوا جس میں اساتذہ و طلبہ سب شریک تھے، اساتذہ حسب معمول اسٹیج پر تشریف فرما تھے، جبکہ طلبہ سامنے اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا ریاست علی صاحب غالباً زرا دیر سے پہنچے ہوں گے تو پیچھے سے اسٹیج پر خالی جگہ نہ دیکھ کر (حالانکہ جگہ آسانی سے نکل سکتی تھی) کسی کو احساس دلائے بغیر

ایک کونے میں جا کر طلبہ کی صفوں میں اس طرح خاموشی سے تشریف فرما ہوئے کہ حاضرین میں سے کسی کو آپ کی آمد کی خبر نہ ہوئی، راقم چونکہ اس وقت مدرس بن گیا تھا، اس لیے وہ بھی اسٹیج پر تھا، یاد پڑتا ہے کہ سب سے پہلے راقم ہی کی نظر پڑی اور بڑی شرمندگی ہوئی کہ ایک ادنیٰ شاگرد اسٹیج پر بیٹھا ہوا ہے اور اساتذہ طلبہ کی صفوں میں!! تو سب سے پہلے احقر ہی نے حضرت والا سے اسٹیج پر آنے کی درخواست کی، اس دوران بڑے اساتذہ بھی متوجہ ہوئے اور ان کو اسٹیج پر بلایا، تب وہ تشریف لا کر اساتذہ کی صفوں میں تشریف فرما ہوئے۔

تیسرا واقعہ:

جس وقت آپ اپنی مایہ ناز تصنیف ”شوریٰ کی شرعی حیثیت“ لکھ رہے تھے تو چند اکابر حضرات سے اس سلسلہ میں باقاعدہ ان کا تبادلہ خیال ہوتا رہا اور ان سے مشورے لیتے رہے، اور ایسا بھی ہوتا رہا کہ کبھی اپنے چھوٹوں اور شاگردوں سے کتاب کے کسی موضوع سے متعلق کوئی سرسری تبادلہ خیال ہو جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صرف ایک ہی مرتبہ خود مجھ سے اس کتاب کے کسی موضوع سے متعلق کوئی سرسری تذکرہ فرمایا اور میری رائے دریافت کی، میں نے اپنی رائے ظاہر کر دی جو درحقیقت حضرت ہی کی رائے کی تائید تھی۔ حضرت والا کی تو اضع و حق بینی کا یہ عالم دیکھئے کہ مذکورہ کتاب کے شروع میں ”پیش لفظ“ کے تحت جہاں ان اکابر کا ذکر کیا ہے جن سے کتاب میں مدد لی گئی ہے وہاں ان اصاغر کا ذکر بھی فرمایا ہے جن سے تبادلہ خیال کیا گیا ہے اور ان کے ضمن میں احقر کا نام بھی شامل کر دیا ہے۔

اللہ ہدایت نصیب فرمائے ان مصنفین کو جو ”علمی سرقہ“ کرتے ہوئے دوسروں کی محنت و کاوش کو اپنا کارنامہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور ان کو بھی جو پورا کام یا اکثر کام دوسروں سے کرواتے ہیں اور نام صرف اپنا ہی لگا لیتے ہیں۔ حضرت والا مدظلہم نے کلیدی محنت خود ہی انجام دی، البتہ ایک معمولی شرکت کی وجہ سے اس کی نسبت دوسروں کی طرف کی ہے:

بہیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بہ کجا

چوتھا واقعہ:

کسی عالم کا اپنے ہم عصر دوسرے عالم کے علم و فضیلت کا اعتراف یا ان سے استفادہ کرنے کا اقرار کرنا اگرچہ بالکل معدوم تو نہیں البتہ شاذ و نادر ضرور ہے، لیکن دارالعلوم دیوبند کے سپوتوں نے بے شمار ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن میں ہم عصروں کی بلندیوں کا اعتراف اور ان کی فضیلت و عظمت کو تسلیم کرنا نمایاں طور پر نظر آتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کی خدمت میں بیعت ہونے کی غرض سے حاضر ہوئے، حضرت شیخ الاسلام نے ان کے اصرار کے باوجود حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی عظمت و فضیلت کا ذکر و اعتراف کرتے ہوئے اُن سے بیعت ہونے کا مشورہ دیا، صرف مشورہ ہی نہیں بلکہ ان کو لے کر تھانہ بھون تشریف لے گئے اور حضرت تھانوی سے ان دونوں کو بیعت کر لینے کی درخواست کی، حضرت حکیم الامت نے بھی حضرت شیخ الاسلام کے مقام کو مد نظر رکھتے ہوئے ان سے فرمایا کہ یہ لوگ چونکہ پہلے

آپ ہی کے پاس حاضر ہوئے ہیں، اس لیے آپ ہی ان کو بیعت کر لیں، چنانچہ حکیم الامتؒ کے اس فرمان کے احترام میں شیخ الاسلامؒ نے دونوں کو بیعت تو کر لیا، لیکن اصلاح کا معاملہ حضرت حکیم الامتؒ کے سپرد کر دیا، حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب دامت برکاتہم کی تواضع سے متعلق جو چوتھا واقعہ میں نقل کرنا چاہتا ہوں وہ بھی اکابرین کی یاد کو تازہ کرنے والا واقعہ ہے:

تصنیف و تالیف کے میدان میں حضرت الاستاذ کا سب سے بڑا کام ”ایضاح البخاری“ شرح صحیح البخاری کی ترتیب ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس کتاب کی ترتیب آپ ہی کی محنتوں کا ثمرہ ہے، لیکن آپ کی تواضع کا یہ عالم ہے کہ اپنے ہم عصر اساتذہ دارالعلوم سے مشکل مقامات پر تبادلہ خیال کرنے اور اس کو استفادہ قرار دینے اور پھر تحریری شکل میں اس کے اعتراف کرنے سے اُن کو کوئی تردد لاحق نہیں ہوتا، چنانچہ ایضاح البخاری جلد چہارم، صفحہ نمبر: ۵ پر ”عرض مرتب“ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: ”اصلاحی نظر کے تدارک کی یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ مشکل مقامات پر دارالعلوم کے بالغ نظر اساتذہ کرام سے رجوع کا اہتمام کیا جاتا ہے، خصوصاً حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی دامت برکاتہم سے عام طور پر تبادلہ خیال، مذاکرہ اور استفادے کا موقع میسر ہے اور حضرت موصوف بھی ازراہ کرم بڑی دلچسپی کے ساتھ وقت مرحمت فرماتے ہیں اور کبھی کبھی حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہم سے بھی تبادلہ خیال یا مشورہ کیا جاتا ہے۔ اللہ ان حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔“

اسی طرح جب حضرت الاستاذ نے ایضاح البخاری جلد ششم کی ترتیب میں اپنے ایک ہونہار نو جوان شاگرد جناب مولانا فہیم الدین صاحب (جو اب دارالعلوم

دیوبند میں مدرس ہو گئے ہیں) سے اپنی سرپرستی میں تعاون لینا شروع فرمایا تو اس تعاون کے اعتراف میں ان کی ہمت افزائی کرتے ہوئے مرتب کی حیثیت سے اپنے نام کے ساتھ ان کا نام بھی بڑھادیا، جسے خود مولانا فہیم الدین صاحب خوردنوازی اور کرم گسٹری قرار دیتے ہوئے ایضاح البخاری جلد ششم، صفحہ نمبر: ۶ پر ”عرض مرتب دوم“ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: ”مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے کہ کتاب کی پیشانی پر میرا نام مرتب کے طور پر آئے، لیکن حضرت والا کی خوردنوازی اور کرم گسٹری ہے کہ مرتب دوم کی حیثیت سے میرا نام آ رہا ہے۔“

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب مدظلہم کے اس عمل سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہیے جو مصنف بننے کے شوق میں مختلف مصنفین کی عبارات لے لیتے ہیں اور ان کا نام یا حوالہ تک ذکر نہیں کرتے، یا دوسروں سے کام کر لیتے ہیں اور نام اپنا ظاہر کرتے ہیں، اور اسی وجہ سے ایسے حضرات کی تصانیف میں کوئی کشش یا نورانیت محسوس نہیں ہوتی۔

بہر صورت! اس مختصر سفر میں حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری دامت برکاتہم کی خدمت میں حاضری و ملاقات کی سعادت بھی نصیب ہوئی اور ان کے گراں قدر ملفوظات سے استفادہ کا موقع بھی میسر ہوا، ساتھ ساتھ انہوں نے احقر کی ہمت افزائی فرماتے ہوئے ایک پُر تکلف دعوت اور کچھ ہدایا - جو میرے لیے تبرکات کی حیثیت رکھتے ہیں - سے بھی نوازا۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی میں صحت و عافیت کے ساتھ برکت عطا فرمائے۔ (۱)

(۱) حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نے ستر سال کی عمر میں ہفتے کی شب ۲۳ شعبان

۱۳۳۸ھ مطابق ۲۰ مئی ۲۰۱۷ء رات چار بج کر دس منٹ پر دعائی اجل کو لبیک کہا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

حضرت الاستاذ مولانا قمر الدین صاحب زید مجدہم کی خدمت میں حاضری

اس سفر میں اللہ کے فضل و کرم سے اپنے استاذ محترم حضرت مولانا علامہ قمر الدین احمد صاحب گورکھپوری دامت برکاتہم العالیہ استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی اور ان کی نصیحتوں اور قیمتی ملفوظات سے استفادہ کا موقع نصیب ہوا۔ آپ نے بہت ہی شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے ہوئے اپنے ملفوظات و مجالس کا مجموعہ ”جواہراتِ قمر“ عنایت فرمایا، اور چائے و پھل فروٹ سے بھی احقر کا اکرام فرمایا۔ احقر نے ان سے حدیث کی دو کتابیں (شرح معانی الآثار اور سنن نسائی) پڑھی ہیں۔

حضرت الاستاذ دارالعلوم کے قدیم ترین استاذوں میں سے ہیں، دارالعلوم دیوبند میں آپ کا تقرر ۱۳۸۶ھ کو حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی (متوفی ۱۳۸۷ھ) قدس سرہ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے توسط سے عمل میں آیا۔ اس وقت سے آج تک پوری نصف صدی گزر چکی ہے کہ آپ دارالعلوم میں پڑھا رہے ہیں۔ ابتدا سے لے کر دورہ حدیث و تکمیلات تک ہر فن پڑھا چکے ہیں اور ہر فن پر عبور رکھتے ہیں۔ اپنے مخدوم و استاذ محترم امام المعقولات حضرت علامہ

بلیاوی قدس سرہ کی خدمت و صحبت کی برکت سے فن معقولات میں آپ کو خصوصی ملکہ حاصل ہے۔ آج کل دورہ حدیث میں صحیح مسلم شریف پڑھا رہے ہیں۔

حضرت الاستاذ پڑھانے کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تربیت و اصلاح پر بھی خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ اس مقصد کے تحت دورانِ تدریس علمی تحقیقات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ طلبہ کو ہدایات و تعلیمات نبویہ پر عمل کرنے کی ترغیب اور اس سلسلہ میں اکابرین کے واقعات بیان کرنا آپ کا معمول ہے۔ بعد العصر آپ کی رہائش گاہ کے قریب واقع مسجدِ طیب میں سالوں سے آپ کی اصلاحی مجالس کا سلسلہ قائم ہے، جس سے طلبہ اور عام نمازیوں کو استفادہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ بیعت و سلوک کے میدان میں آپ کو اپنے استاذ و مخدوم حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی قدس سرہ اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحق ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت و خلافت حاصل ہے۔

تقریباً ۷ سال سے شہر آمبور (تمل ناڈو) کی ایک مسجد میں رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے ہیں۔ ان ایام میں اپنے مواعظ و گراں قدر مجالس سے ایک بڑے مجمع کو مستفیض فرماتے ہیں۔ آپ کے ایک شاگرد جناب مولانا سعادت اللہ خاں صاحب قاسمی نے ان مواعظ کو ترتیب دے کر ”جواہراتِ قمر“ کے نام سے جلد اول شائع کر دی ہے۔ اللہ سے امید ہے کہ جواہرات کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

حضرت الاستاذ کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں، اختلافات کا حصہ نہیں بنتے، اگر خدا نخواستہ اختلافات کا کوئی واقعہ رونما ہو جاتا ہے

تو بالکل الگ تھلگ ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ رواں ہجری صدی کے شروع میں دارالعلوم دیوبند میں جب اختلافات کا ایک طوفان اٹھا تو انہوں نے کافی حد تک یکسوئی اختیار کی اور جب اللہ تعالیٰ نے مجلس شوریٰ کی زیر سرپرستی دارالعلوم کو دوبارہ کھلوا یا اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے پھر سے پڑھانا شروع فرمایا جو آج تک جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی میں صحت و عافیت کے ساتھ برکت عطا فرمائے۔

حضرت مہتمم صاحب سے ملاقات

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم و استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند سے بھی اس سفر میں متعدد نیاز مندانہ ملاقاتیں ہوئیں اور انہوں نے بھی احقر کو اکرام سے نوازا، جس زمانہ میں احقر دارالعلوم میں مقیم تھا، اس وقت دارالعلوم کی تدریس یا انتظام سے مفتی صاحب کی وابستگی نہیں تھی، البتہ حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہ صدر مفتی دارالعلوم دیوبند سے چونکہ ان کا اصلاحی تعلق تھا (اس وقت حضرت فقیہ الامت کے اجل خلفاء میں ان کو شمار کیا جاتا ہے) اور ان کی خدمت میں وقتاً فوقتاً دیوبند حاضری دیتے رہتے تھے اور احقر کا بھی حضرت فقیہ الامت قدس سرہ سے اصلاحی تعلق قائم ہو گیا تھا اور ان کی مجلسوں میں حسبِ توفیق شریک ہوا کرتا تھا، اس دوران مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب سے بھی ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔

پاکستان منتقلی کے بعد احقر کو پتہ چلا کہ مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی کو مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کا رکن منتخب کیا گیا ہے جس سے دل بہت خوش ہوا، اس لیے کہ موصوف میں اس اہم ذمہ داری کی اہلیت موجود تھی، اور جب ۱۴۳۲ھ کو حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا انتقال ہوا اور مادرِ علمی کا سب سے اہم اور نازک یہ عہدہ کچھ آزمائش و امتحان کے دور سے گزرنے لگا،

اور اندرونِ ملک و بیرونِ ملک پھیلے ہوئے بھی خواہانِ دارالعلوم کے قلوب اپنے رب کی طرف متوجہ ہو کر ان دعاؤں میں مصروف ہو گئے کہ اے اللہ! دارالعلوم کو ایک مخلص، مدبر، باصلاحیت اور اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے والا خادم (مہتمم) مہیا فرما، تو بالآخر وہ دعائیں رنگ لائیں اور مجلس شوریٰ نے حضرت مولانا مفتی ابولقاسم صاحب نعمانی کو مستقل مہتمم کی حیثیت سے منتخب کیا جس پر تمام بھی خواہان و خیر خواہانِ دارالعلوم نے اطمینان کا اظہار کیا۔

دارالعلوم کے دیگر مشائخ کرام سے ملاقاتیں

اپنے اساتذہ کرام اور حضرت مہتمم صاحب کے علاوہ حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمی^(۱)، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی، حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدرسی (نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند)، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی (مدیر ماہنامہ دارالعلوم)، حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری، حضرت مولانا محمد امین صاحب پالن پوری اور حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب بستوی دامت برکاتہم العالیہ (اساتذہ حدیث دارالعلوم دیوبند) سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

مذکورہ تمام حضرات اس زمانہ سے دارالعلوم میں پڑھا رہے ہیں جس زمانہ میں راقم الحروف بھی دارالعلوم کے خادموں میں سے ایک خادم تدریس کی حیثیت سے وہاں کام کر رہا تھا۔ ان تمام حضرات کی عظمت و فضیلت کا اس وقت بھی قائل تھا اور آج بھی ہوں، البتہ اُن سے پڑھنے کی سعادت میسر نہیں ہو سکی ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اس سفر میں ان تمام حضرات سے خوشگوار ماحول میں ملاقاتیں ہوئیں، اور ماضی کی دلچسپ یادوں کو تازہ کیا اور انہوں نے احقر کی ذرہ نوازی و اکرام بھی فرمایا۔

(۱) ہفتے کی شب یکم ربیع الثانی ۱۴۳۸ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۲۰۱۶ھ حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمی کا انتقال

جناب مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب سے

ملاقات

اپنی مادرِ علمی کے اس سفر کے دوران جناب مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب زید مجدہم استاذ ادب عربی و مدیر مجلہ عربی ”الدّاعی“ دارالعلوم دیوبند سے ان کے گھر پر ملاقات کی سعادت حاصل کی، جہاں موصوف نے اپنے نفیس دسترخوان پر چائے و دیگر لوازمات سے احقر کا اکرام کیا، مولانا کا تقرر دارالعلوم میں ماہِ شوال ۱۴۰۲ھ کو بحیثیت استاذ ادب عربی و مدیر جریدہ عربی ”الدّاعی“ ان کے استاد و مربی حضرت مولانا وحید الزمان صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۴۱۵ھ) سابق استاذ و معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تحریک پر ہوا، احقر اس وقت تخصص فی الفقہ (شعبہ افتاء) کا طالب علم تھا اور چند ہی مہینے بعد ماہِ صفر ۱۴۰۳ھ کو دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے احقر کا تقرر بھی عمل میں آیا، اس وقت سے جناب مولانا نور عالم صاحب کو جانتا ہوں۔

میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا نور عالم صاحب نے اپنے مربی حضرت مولانا وحید الزمان صاحب قدس سرہ کی تمنا کے مطابق بلکہ اس سے بھی بڑھ کر عربی ادب کے میدان میں خدمت انجام دی، ایک طرف سے انہوں نے

ایسے لائق و فائق شاگرد تیار کر دیئے جنہوں نے دارالعلوم سے فراغت کے بعد پورے ملک و بیرون ملک کے تعلیمی اداروں میں عربی ادب و عربی زبان کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے خوب کام کیا، اور دوسری طرف سے مولانا نے عربی مجلہ ”الذاعی“ کو بام عروج پر پہنچایا، ”الذاعی“ کا اجراء دارالعلوم دیوبند سے حضرت مولانا وحید الزمان صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی زیر سرپرستی اور مولانا بدر الحسن صاحب قاسمی کی زیر ادارت ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۹۷۶ء کو پندرہ روزہ عربی جریدے کی صورت میں شروع ہوا۔ ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۹۸۲ء کو اس کی ادارت جناب مولانا نور عالم امینی صاحب کے سپرد ہوئی، مولانا نے اپنی محنت و خداداد صلاحیت کے ذریعہ اس کو ترقی دیتے ہوئے ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۹۹۳ء کو ظاہری و باطنی حسن سے آراستہ ماہوار مجلہ کی شکل میں نکالنا شروع کیا جو تاحال جاری ہے، اس مجلہ نے عالم اسلام اور بالخصوص عالم عرب میں یہ ثابت کر دیا کہ دارالعلوم دیوبند کو صرف فقہ و حدیث و تفسیر و دیگر فنون ہی میں نہیں، عربی ادب میں بھی مرکزیت حاصل ہے، مجلہ ”الذاعی“ اور اس کے مدیر مولانا نور عالم صاحب کی مقبولیت عامہ کی مناسبت سے دو واقعے نمونہ کے طور پر سپرد قلم کرتا ہوں:

پہلا واقعہ

۱۴۱۵ھ مطابق ۱۹۹۴ء ملاقاتی ویزا کے ذریعہ احقر کا ریاض سعودی عرب جانا ہوا، اسی سفر میں ”إدارة الدعوة في الخارج“ (جو پہلے دارالافتاء کا اور اب وزارت مذہبی امور کا ایک ذیلی ادارہ ہے) کے ایک ذمہ دار سعودی عالم شیخ

عبدالرحمن المہیزع رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی، وہ اہل زبان ہونے کے ساتھ ساتھ عربی ادب اور مطالعہ کتب کا کافی ذوق و شوق رکھتے تھے اور ان کے پاس اندرون ملک اور بیرون ملک سے آئے ہوئے عربی رسائل و اخبارات کا ڈھیر لگا رہتا تھا، انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان تمام رسائل میں سرفہرست ”الداعی“ کو سمجھتا ہوں، اور اس کو سب سے اوپر رکھ کر شروع سے آخر تک پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں، اس کی جامعیت، صاف گوئی، تصاویر سے خالی ہونے، ظاہری و باطنی جمال اور بالخصوص شیخ نور (مولانا نور عالم صاحب) کے ”کلمۃ العدد“ اور ”اشراقہ“ نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔

دوسرا واقعہ

ماہ محرم ۱۴۲۸ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۰۷ء کو سعودی عرب کے نائب وزیر مذہبی امور محترم شیخ عبدالعزیز العمار کی سرکردگی میں ایک وفد نے پاکستان کے دینی مدارس کا دورہ کیا تھا، جس کے اعزاز میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان نے ”ریجنٹ پلازہ“ (Regent Plaza) کراچی میں جلسہ منعقد کیا تھا جس میں پاکستان بھر سے بڑے بڑے علماء، مدارس کے ذمہ داران، وفاقی وزیر مذہبی امور پاکستان اور دیگر معززین شریک ہوئے تھے۔ اس عظیم الشان جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے شیخ عبدالعزیز العمار نے دارالعلوم دیوبند اور مسلک دیوبند کے دیگر مدارس کی دینی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس ضمن میں عربی مجلہ ”الداعی“ اور اس کے مدیر محترم مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب کا بلند القاب کے ساتھ ذکر کیا

جس سے مسلک دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء (بالخصوص اس حقیر طالب علم) نے بڑی مسرت و خوشی محسوس کی۔ اللہ تعالیٰ مولانا نور عالم صاحب کو صحت و تندرستی کے ساتھ تادیر عربی زبان اور دارالعلوم دیوبند کی خدمت کا موقع عنایت فرمائے۔

اپنے ہم عصر اور دوست اساتذہ سے ملاقاتیں

اپنی زندگی کے اس ناقابل فراموش سفر میں جہاں اپنے اساتذہ کرام اور دیگر مشائخ عظام کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا، وہاں اپنے ان ہم عصر اور دوست اساتذہ کا دیدار اور ان سے شرفِ لقاء بھی نصیب ہوا جن کے ساتھ ماضی میں بے تکلف ملاقاتیں، دعوتوں کا تبادلہ، بعد العصر اکثر ایک ہی ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلنے اور دارالاقامہ کا نظام ایک ہی ساتھ سنبھالنے کا سلسلہ رہا تھا۔ ان حضرات میں سے جناب مولانا عبدالحق صاحب سنبھلی (جو آبِ نائب مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند بھی بنائے گئے ہیں) اور جناب مولانا محمد نسیم صاحب بارہ بنکوی سرفہرست ہیں۔

ان دونوں حضرات اور احقر کا ایک ہی ساتھ دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی سال ۱۴۰۲ھ - ۱۴۰۳ھ کو تقرر ہوا تھا، حسن اتفاق سے تینوں کو بچوں سمیت ایک ہی عمارت ”دارالمدرسین“ میں رہائش بھی ملی تھی، اس سفر میں پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر دارالمدرسین ہی میں مولانا محمد نسیم صاحب کے دسترخوان پر تینوں نے ایک ہی ساتھ ناشتہ کیا، ناشتہ کے بعد ان کے قریب میں رہائش پذیر بزرگ استاذ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب بستوی سے ملاقات

ہوئی جنہوں نے بہت اکرام کیا، موصوف شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ کے شاگردوں میں سے ہیں (دارالعلوم میں حضرت مدنی قدس سرہ کے شاگرد چند ہی رہ گئے ہیں) اور طلبہ میں ایک مقبول و مشفق استاد کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں، عمر میں ہم تینوں سے کافی بڑے ہیں، لیکن اپنی تواضع کی بنیاد پر ہمارے ساتھ ان کا معاملہ بے تکلف دوستوں جیسا ہوا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے۔ (۱)

چند نو جوان اساتذہ سے ملاقاتیں

اس باسعادت سفرِ دارالعلوم دیوبند میں چند اُن نو جوان اساتذہ کرام سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا جن کی تقریریاں دارالعلوم سے میری واپسی کے بعد ہوئی ہیں۔ ان حضرات کا علمی انہماک، تدریسی ذمہ داری کو نبھانے کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان سے بھی اچھی دلچسپی اور اپنے بڑوں اور اساتذہ سے مضبوط تعلق اور ان کے مشوروں سے چلنا، ان تمام امور کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ الحمد للہ! مادرِ علمی کا علمی و عملی دونوں میدانوں میں امتیاز جیسا کہ ہمیشہ برقرار رہا ہے، ایسا ہی آئندہ بھی ان جیسے نو جوانوں کے ذریعہ ان شاء اللہ! برقرار رہے گا۔

ان نو جوان اساتذہ میں جناب مولانا عبداللہ صاحب معروفی، جناب مولانا عارف جمیل صاحب قاسمی، جناب مولانا محمد ساجد صاحب قاسمی، جناب مولانا محمد علی

(۱) بروز بدھ ۲۴ ذوالقعدہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۹ ستمبر ۲۰۱۵ء حضرت مولانا عبدالرحیم بستوی صاحب کا انتقال

صاحب بجنوری، جناب مولانا توحید عالم صاحب قاسمی، جناب مولانا محمد عثمان صاحب ہوڑوی، جناب مولانا اشرف عباس صاحب قاسمی وغیرہ (زید مجدہم) شامل ہیں۔

نوجوان اساتذہ کرام میں سے کچھ حضرات نے اپنی تالیفات کا ہدیہ بھی پیش کیا، فجزاہم اللہ خیرًا، ان تالیفات کو دیکھ کر ان کی صلاحیتوں اور محنتوں کا اندازہ ہوا، بالخصوص مولانا عبداللہ صاحب معروفی استاد شعبہ تخصص فی الحدیث کی تالیف ”حدیث اور فہم حدیث“ سے دل کافی خوش ہوا، یہ کتاب ۴۰۵ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں علم حدیث کی تعریف و تقسیم، حجت حدیث و فتنہ انکار حدیث، تاریخ تدوین حدیث و ہندوستان میں علم حدیث، درسی کتب حدیث کا مختصر تعارف اور قواعد تخریج وغیرہ اہم موضوعات سے متعلق اختصار کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

اسی طرح مولانا محمد ساجد صاحب قاسمی استاد دارالعلوم دیوبند اور مولانا عبدالقدوس صاحب قاسمی استاد دارالعلوم زکریا جنوبی افریقہ دونوں کی محنت سے تیار شدہ کتاب ”القراءة العربیة“ بھی کافی پسند آئی۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے جس میں ماہرین تعلیم عرب ادباء کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے، لیکن غیر عرب طلبہ کی استعداد کو بھی سامنے رکھا گیا ہے اور ایسے ”نصوص و تمارین“ کا انتخاب کیا گیا ہے جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ جاذبیت بھی رکھتے ہیں اور عربی زبان کے ساتھ ساتھ اسلامی آداب بھی سکھاتے ہیں۔

نوجوان اساتذہ میں سے مولانا عارف جمیل صاحب قاسمی مدرس دارالعلوم دیوبند (جن کا تدریس کے ساتھ ساتھ حال ہی میں اپنے استاد و مربی جناب مولانا

نور عالم خلیل امینی صاحب مدیر عربی مجلہ ”الداعی“ کے معاون کی حیثیت سے انتخاب بھی عمل میں آیا ہے) کے عربی مضامین جو ”الداعی“ میں چھپتے رہتے ہیں، بالخصوص ”تاریخ دارالعلوم دیوبند“ (اردو) کی قسط وار تعریب کو دیکھ کر دل سے اُن کے لیے دعا نکلی، اللہ تعالیٰ پایہ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

جامع مسجد رشید میں نمازِ جمعہ کی امامت

دارالعلوم دیوبند میں اس مختصر قیام کے دوران دفترِ اہتمام کی طرف سے جامع مسجد رشید کے امام صاحب کے ذریعہ یہ پیغام موصول ہوا کہ احقر بروز جمعہ ۹/۷/۱۴۳۵ھ مطابق ۹/۵/۲۰۱۴ء کو جامع مسجد رشید میں نمازِ جمعہ پڑھا کر پرانی یادوں کو تازہ کرادے، اس حکم کو اپنے لیے سعادت سمجھ کر اس امید پر قبول کیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اس دنیا میں میری خامیوں اور نااہلیت پر پردہ ڈال کر علماء و صلحاء کی ایک عظیم جماعت کی امامت و خطابت کا موقع دے رہا ہے، شاید قیامت میں بھی ان ہی صلحاء کے طفیل میں اس گنہگار کا بیڑا پار کرادے۔

جامع مسجد رشید میں اہل علم کے اس بارعب و بابرکت اجتماع اور عنقریب آنے والے سالانہ امتحان کی مناسبت سے احقر نے اپنے خطبہ میں علم اور اہل علم کی فضیلت سے متعلق قرآن پاک کی چند آیتیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چند حدیثیں تشریح کے ساتھ پیش کیں، اور امتحانات کی مناسبت سے صحیح البخاری میں ”کتاب العلم“ کے اندر امتحان کی اہمیت سے متعلق قائم شدہ عنوان ”بابُ طرح الإمام المسألة علی أصحابہ لیختبر ما عندهم من العلم“ کا ذکر کیا، اور پھر مذکورہ باب کے تحت

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے جو حضرت عبداللہ بن عمر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت نقل کی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے صحابہؓ کے سامنے ایک سوال پیش کرنے اور ان سے جواب طلب کرنے کا تذکرہ ہے وہ بھی پڑھی، اور ساتھ ساتھ ان دنیوی امتحانات کی مناسبت سے قبر میں تین سوالات پر مشتمل نکیر و منکر کے امتحان اور اس کی تیاری کی ضرورت اور پھر قیامت کے دن جو تفصیلی امتحان ہوگا اس کا بھی تذکرہ اور اس کی تیاری کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی۔

نماز پڑھانے کے بعد دعا کے دوران دارالعلوم دیوبند اور اس کے اساتذہ کرام و طلبہ عزیز کی عظمت، دارالعلوم کے درو دیوار سے احقر کی دیرینہ وابستگی، اس کے احاطہ میں ایک اچھا خاصا وقت گزارنے اور پھر جسمانی طور پر اس سے ایک طویل جدائی اور جدائی کے بعد ایک مرتبہ پھر اس کی چار دیواری میں نیاز مندانہ حاضری کا تصور کرتے ہوئے مجھ پر رقت طاری ہوگئی جس کو دبانے کی کوشش میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا۔ سنتوں سے فارغ ہونے کے بعد دارالعلوم کے چند اساتذہ کرام، طلبہ عزیز کی ایک بڑی تعداد اور شہر دیوبند کے رہنے والے کچھ پرانے جاننے والے اور کچھ نئے حضرات سے شرفِ مصافحہ کا موقع نصیب ہوا، اس دوران یہ بھی پتہ چلا کہ دارالعلوم کے جوان اساتذہ میں سے تقریباً سات آٹھ اساتذہ ایسے ہیں جنہوں نے احقر سے دارالعلوم میں مدرس کے زمانہ میں کچھ نہ کچھ پڑھا ہے، یہ جان کر اللہ کا شکر ادا کیا اور بڑی خوشی ہوئی کہ دارالعلوم کے درو دیوار کے اندر احقر کی خدمت کا سلسلہ اب بھی بحمد اللہ ایک حد تک بالواسطہ جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو کامیابی کے ساتھ جاری و ساری رکھے۔

شہر دیوبند کے چند دیگر دینی اداروں کی زیارت

اس دلچسپ سفر میں دارالعلوم کے علاوہ شہر دیوبند کے چند دیگر ایسے دینی اداروں کی زیارت کا موقع بھی ملا جو احقر کی مدرسی کے زمانے میں موجود نہیں تھے، ان اداروں میں سے ایک ”دارالعلوم (وقف)“ ہے جس کے مہتمم حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہم ہیں۔ اس ادارہ نے مختصر مدت میں بڑی ترقی کی ہے، جب میں دیوبند میں تھا اس وقت ”دارالعلوم (وقف)“ قائم تو ہو گیا تھا، البتہ عمارت نہ ہونے کی وجہ سے اس نے شہر دیوبند کی جامع مسجد میں کام شروع کر دیا تھا اور عید گاہ کے قریب اس کے لیے مستقل عمارت کے ارادہ سے زمین حاصل کر لی گئی تھی، اس سفر میں راقم نے دیکھا کہ اس زمین پر ایک شاندار عمارت کھڑی ہے جس میں درس گاہیں، دارالاقامہ، دفاتر اور مدرسہ کی تمام ضروریات کا انتظام موجود اور تعلیم کا سلسلہ جاری ہے، اور سب سے اچھی اور باعث اطمینان چیز یہ نظر آئی کہ اب الحمد للہ! اختلاف کی کیفیت بھی ختم ہو چکی ہے اور دونوں ادارے (دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم وقف) اپنے اپنے دینی کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور ذمہ داران کا آپس میں اچھا تعلق بھی قائم ہے۔

مولانا عبدالرشید صاحب بستوی فاضل دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر دیوبند کے ایک اور دینی ادارے ”جامعۃ الإمام محمد أنور کشمیری“ کی زیارت کا موقع بھی ملا، اور مولانا موصوف - جو مذکورہ ادارہ کے ایک قابل استاد اور صدر المدرسین اور احقر کے مخلص دوست ہیں - کی خواہش پر طلبہ کی تقریری

انجمن کے اختتامی پروگرام میں شریک ہو کر طلبہ کی خدمت میں چند باتیں بھی عرض کیں، مولانا نے احقر کا بہت اکرام کیا اور رات کے کھانے پر مدعو بھی کیا۔

اسی طرح ”الجامعة الإسلامية للبنات“۔ جس کے بانی و مدیر جناب مولانا سید اسجد صاحب مدنی زید مجدہم ہیں۔ کی زیارت کے لیے بھی حاضر ہوا اور اس کی نفاست و نظافت اور حسن انتظام کو دیکھ کر دل خوش ہوا، مولانا خود چونکہ سفر میں تھے، اس لیے ان سے شرفِ ملاقات حاصل نہ کر سکا جس کا قلق اب تک باقی ہے، البتہ ان کے ہونہار صاحبزادے جناب مولانا حسن صاحب مدنی سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے ایک پُر تکلف دعوت سے بھی نوازا۔ میرے ایک اور مخلص دوست مولانا منزل حسین صاحب آسامی کا قائم کردہ مدرسہ ”جامعة الشيخ حسين أحمد المدني“ کی زیارت بھی نصیب ہوئی اور مولانا موصوف نے بھی احقر کا اکرام کیا اور ایک پُر تکلف دعوت پر مدعو بھی کیا۔

قریب میں واقع ”شیخ الاسلام اکیڈمی“ جس کی نگرانی محترم مولانا سید امجد صاحب مدنی فرما رہے ہیں کہ زیارت اور وہاں کے علمی و اشاعتی کاموں سے آگاہی و خوشی حاصل ہوئی، بالخصوص ”تحفة الأحوذی شرح جامع الترمذی“ پر مولانا سید امجد مدنی صاحب باریک اللہ فی علومہ و جہودہ کے تحقیقی کام (جس کا سلسلہ جاری ہے) سے دل بڑا خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ پایہ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

دارالعلوم دیوبند کی ترقی کے چند اہم اسباب

اس سفر کے دوران اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے ماضی و حال پر غور کرتا ہوا اور اس کی بے مثال ترقی کا تصور کرتا ہوا ذہن اس طرف متوجہ ہوا کہ اس حیرت انگیز کامیابی کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ آخر میں چند اہم اسباب کی طرف ذہن منتقل ہوا جن کو اختصار کے ساتھ قلمبند کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

۱:- اخلاص وللہیت

اللہ تعالیٰ نے اکابرین دارالعلوم کو اخلاص وللہیت کا بھرپور حصہ عطا فرمایا تھا، بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا پیش کردہ آٹھ دفعات پر مشتمل دستور العمل جو ”اصول ہشتگانہ“ کے نام سے مشہور ہے، ایک بے نظیر دستور ہے۔ اُن آٹھ اصولوں بالخصوص اصل نمبر چھ اور اصل نمبر آٹھ پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بانی کو اللہ تعالیٰ نے اخلاص و توکل علی اللہ کا حصہ وافر عطا فرمایا تھا، ملاحظہ ہوا اصل نمبر چھ:

”اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ! بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد

غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سرو سامانی ملحوظ رہے۔“

اور اصل نمبر آٹھ بھی حرف بحرف نقل کی جاتی ہے:

”تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔“

اخلاص کا یہ سلسلہ دارالعلوم دیوبند کے ماحول میں ہر زمانہ کے اندر جاری رہا ہے اور مستقبل میں بھی ان شاء اللہ! جاری رہے گا۔ حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۴۳۲ھ) رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے دورِ اہتمام میں مدرسہ سے کسی قسم کی رعایت و سہولت قبول نہ کرنا اور نہ ہی اپنے فائق فرزند یا خاندان کے دوسرے فرد کو مدرسہ میں لگانا اس سلسلہ اخلاص کی بقاء کی واضح دلیل ہے۔

۲:- محنت و سادگی

علم کی ترقی کے لیے مستقل محنت کی ضرورت ہوتی ہے، اور چونکہ محنت و سادگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اس لیے محنت وہی شخص کر سکتا ہے جس کی زندگی میں سادگی ہو، جو لوگ سہولت پسندی اور پر تعیش زندگی کے عادی ہوتے ہیں ان سے علمی میدان میں محنت نہیں ہو سکتی، انہیں تو ہمیشہ عمدہ سے عمدہ لباس، پر تکلف دعوتوں اور مہنگے ہوٹلوں کے کھانوں، غیر ضروری اسفار، عمدہ اور جدید ترین سواریوں اور نئی نئی سہولتوں پر مشتمل رہائش گاہوں کی فکر دامن گیر رہتی ہے، علمی کاموں کے لیے نہ

ان کے پاس فرصت ہوتی ہے اور نہ ہی محنت و مشقت برداشت کرنے کا حوصلہ۔
 اکابر و فرزندِ انِ دارالعلوم دیوبند کی گھنٹی میں محنت و سادگی دونوں شامل ہیں۔
 بانی دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ سے لے کر آج
 تک علمائے دارالعلوم کی زندگیاں محنت و سادگی سے بھرپور، تکلفات سے دور اور
 خواہشات کی پیروی سے خالی نظر آتی ہیں، ان کی دنیوی تمنائیں قلیل اور اخروی
 مقاصد جلیل ہوا کرتے ہیں، اس لیے انہوں نے تدریس و تعلیم، تصنیف و تالیف،
 دعوت و تبلیغ، بدعات و فتن کی سرکوبی اور ہر دینی میدان میں ایسے کارنامے انجام
 دیئے ہیں کہ ان کی بلندیوں کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے، ان ہی کارناموں اور
 کامرانیوں نے دارالعلوم کی معنویت کو بلند و بالا کر دیا ہے:

اس کا رخ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں

اس سفر کے دوران میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ محنت و سادگی کا وہ
 ماحول جو ۲۳ سال قبل میں نے دیکھا تھا، وہ اب بھی تقریباً اسی طرح برقرار ہے۔
 علی سبیل المثال میں نے مشاہدہ کیا کہ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن
 پوری شیخ الحدیث و صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند زید مجدہم کا ایک سادہ سا مکان
 ہے۔ بیٹھک میں معمولی پلاسٹک کافرش بچھا ہوا ہے۔ ایک طرف حضرت الاستاذ کی
 زمینی نشست گاہ اور اس کے سامنے لکڑی کی معمولی سی لیکن چوڑی تپائی رکھی ہوئی
 ہے جس کے اوپر قلم و کاغذ اور زیر مطالعہ اہم کتابیں سلیقے اور ترتیب سے رکھی ہوئی
 ہیں، اور میرے خیال میں وہ تپائی رنگ و پالش کے تکلف سے بھی آزاد تھی، یہی وہ
 تپائی ہے جس پر حضرت شیخ الحدیث مدظلہم مطالعہ بھی فرماتے ہیں اور تصنیف و

تالیف کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں، اور اسی تپائی پر ہزاروں صفحات پر مشتمل کئی شروحات و دیگر کتابیں تالیف فرما چکے ہیں۔ اپنی نشست کے ساتھ ہی پیچھے اور دائیں طرف زیر مطالعہ کتابوں کی چند سادی سی الماریاں ہیں، اور ساتھ ساتھ اس کا مشاہدہ بھی ہوا کہ لباس، کھانے پینے، نشست و برخاست بلکہ تمام عادتوں میں سادگی ہے اور ایک دقیق نظام الاوقات کے تحت درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے۔

حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم کے ساتھ ان کی بیٹھک میں بار بار ناشتہ اور کھانا کھانے کی نوبت پیش آئی، میں نے دیکھا کہ بیٹھک کا رنگ و روغن کافی پرانا ہو چکا ہے اور جگہ جگہ سے ختم ہو کر پلاسٹر بھی نظر آنے لگا ہے۔ کھانے کے لیے چمڑے کا گول اور سادہ سا دسترخوان زیر استعمال ہے۔ بیٹھک سے باہر برآمدے میں زائرین اور حضرت والا کے بیٹھنے کے لیے معمولی لکڑی کی بنی ہوئی چند پیئچیں رکھی ہوئی ہیں۔ البتہ یہ بھی محسوس ہوا کہ بیٹھک اور برآمدے دونوں میں اس سادگی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سکون اور بلا کی کشش موجود ہے جو ہر زائر کو زبانِ حال سے سادگی اختیار کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔

ایسی ہی سادگی و محنت کا مشاہدہ حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری استاذ حدیث، حضرت الاستاذ مولانا قمر الدین صاحب استاذ حدیث، حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمی استاذ حدیث، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی استاذ حدیث اور دیگر اساتذہ دارالعلوم کے یہاں بھی ہوا۔ ان تمام جبال

العلم کی محنت و سادگی کو دیکھ کر ہر ذی شعور شخص کو یہ خیال ضرور آتا ہے کہ مادیت کے اس دور میں دنیوی لذات کو اس طرح پس پشت ڈالنا اس بات کی علامت ہے کہ ان حضرات نے دنیوی زندگی کی حقیقت کو صحیح معنوں میں سمجھا ہے کہ وہ صرف ”متاع الغرور“ (دھوکے کا سودا) ہے، اور آخرت کے بارہ میں بھی یہ حضرات اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ”وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ“ (اور ہمیشہ کی زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے) مستقل طور پر سامنے رکھے رہتے ہیں۔

۳:- باختیار شوریٰ نظام

دارالعلوم دیوبند کا نظم و نسق شروع ہی سے ”وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ“ کے اصول پر قائم ہے، اہل علم و تقویٰ پر مشتمل ایک باختیار مجلس شوریٰ عزل و نصب اور دیگر تمام اہم امور کی نگرانی کرتی ہے اور اس کو مکمل اختیار و بالادستی حاصل ہے، ”تاریخ دارالعلوم دیوبند“ کی تصریح کے مطابق ابتدائی مجلس شوریٰ سات ارکان پر مشتمل تھی جن میں سرفہرست حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حاجی عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام نامی ہیں، بلکہ حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری دامت برکاتہم نے اپنی مایہ ناز کتاب ”شوریٰ کی شرعی حیثیت“ میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ مجلس شوریٰ کی تشکیل قیام دارالعلوم سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔

اس باختیار مجلس شوریٰ کی برکت سے دارالعلوم اقرباء پروری، نامناسب یا غیر ضروری تقرریوں اور دیگر فتن سے محفوظ ہے، اور دن بہ دن ترقی کی طرف گامزن ہے۔ جن اداروں میں شورائیت نہیں یا برائے نام ہے وہ ادارے ترقی

کے بجائے تنزل کی طرف سفر کرتے ہیں اور ان کی کارکردگی کمزور ہو کر آخر کار ختم ہو جاتی ہے۔

۴:- وقفے وقفے سے نتیجہ خیز اختلافات کا رونما ہونا

مسلمانوں کے درمیان ذاتی و دنیوی مقاصد کے تحت اختلافات کو قرآن و سنت نے واضح طور پر منع فرما دیا ہے اور ایسے اختلافات کو مسلمانوں کی ناکامی کا سبب قرار دیا ہے، البتہ اصلاح کی غرض سے نیک نیتی کے ساتھ اگر کوئی آواز اٹھتی ہے اور اس سے بظاہر مسلمانوں کے درمیان ایک اختلاف کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، یا فرعی مسائل کے اندر حق کی تلاش میں ارباب اجتہاد کے درمیان کوئی اختلاف رونما ہو جاتا ہے تو ایسا اختلاف اپنے نتیجہ کے اعتبار سے باعثِ رحمت اور موجبِ ثواب بن جاتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے علمی سمندر میں وقفے وقفے سے نیک نیتی پر مبنی اختلافات کا ایک طوفان اٹھنے لگتا ہے اور اس کی موجیں آپس میں ٹکراتی ہیں، اس طوفان سے بظاہر کچھ نقصانات بھی واقع ہو جاتے ہیں، مگر انجام کار یہ نظر آنے لگتا ہے کہ ان جزوی نقصانات میں کوئی نفع کلی مضمر تھا، اور اس تلاطم کے نتیجہ میں دارالعلوم کی اصلاح و ترقی، اس کی آواز کی وسعت و پھیلاؤ اور اس کے سرچشمہ فیض و برکت سے زیادہ سے زیادہ تشنگانِ علوم نبوت کو سیراب کرنا مقدر تھا۔

چنانچہ قیامِ دارالعلوم (۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ) کے تقریباً اکٹھ سال بعد ۱۳۴۲ھ کو اسی قسم کے اختلافات کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس نے ایک طوفان کی شکل اختیار کی

اور ۱۳۴۷ھ تک باقی رہا۔ اس کے نتیجہ میں علمائے دیوبند کی ایک جماعت نے حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۵۲ھ) کی سربراہی میں دارالعلوم کے درودیوار سے کوچ کرتے ہوئے اس کے پیغام کو لے کر گجرات کے دور افتادہ علاقہ کو۔ جو بدعت کدہ بنا ہوا تھا۔ علوم نبوت سے سیراب کر دیا، اور ان کے ذریعہ ڈابھیل میں ایک عظیم الشان دینی مرکز نمودار ہوا جس کے فیوض و برکات کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ دوسری طرف اس اختلاف کے نتیجہ میں دارالعلوم کی مسندِ حدیث کے لیے اللہ تعالیٰ نے جانشینِ شیخ الہند، سابق مدرس مسجد نبوی شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کا انتخاب فرمایا جن کے دریائے علم و معرفت سے اکتیس سال تک بے شمار تشنگانِ علوم دینیہ و متلاشیانِ معرفتِ حق سیراب ہوتے رہے۔

اسی طرح مذکورہ اختلاف کے تقریباً تریس سال بعد رواں پندرہویں صدی ہجری کی ابتداء میں ایک مرتبہ پھر دارالعلوم کے سمندرِ علم میں تلاطم پیدا ہوا جس سے پورے برصغیر کے دینی حلقوں میں ایک ہلچل و ہيجان کی کیفیت پیدا ہو گئی، اور زمین کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے متبعینِ مسلک اہل حق اور محبینِ دارالعلوم کو بڑی فکر لاحق ہوئی کہ اس اختلاف کے نتیجہ میں اکابرین کی اس امانت اور دینِ اسلام کے اس اہم مرکز کو کہیں کوئی بڑا نقصان لاحق نہ ہو جائے، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے دنیا نے دیکھا کہ دارالعلوم محفوظ رہا، بلکہ ایک نئے ولولے کے ساتھ مجلس شوریٰ کی زیرِ قیادت اور ایک ولی صفت، مدبر و مخلص اور منیب الی اللہ شخصیت حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے زیرِ اہتمام مزید

ترقی کی طرف گامزن ہوا، اور ساتھ ساتھ علمائے حق کا ایک نیا ادارہ بھی دیوبند کی سرزمین پر دارالعلوم (وقف) کے نام سے عالم وجود میں آیا جس سے دینی مراکز کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

۵:- صلاحیت و صالحیت کی بنیاد پر تقرریاں و ترقیاں

دارالعلوم دیوبند کو اللہ تعالیٰ نے گونا گوں خصوصیات و خوبیوں سے نوازا ہے، ان خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ صرف صلاحیت و صالحیت کی بنیاد پر تقرریاں ہوتی ہیں اور اسی بنیاد پر ترقیاں ملتی ہیں۔ نسب، رشتہ داری اور علاقائیت کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس بات کی ایک واضح نشانی یہ ہے کہ اس وقت منصبِ اہتمام پر فائز حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب کا تعلق ضلع ”بنارس“ سے ہے، ان کے نائب جناب مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی کا تعلق ”مدراس“ (چینائی) سے ہے، شیخ الحدیث و صدر المدرسین حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کا تعلق ”گجرات“ سے ہے۔ انتظامی اور علمی اعلیٰ مناصب پر فائز ان تینوں حضرات میں سے کسی کا بھی دارالعلوم کے اکابرین جیسے حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، حضرت شیخ الہند، حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مدنی، حضرت شیخ الادب، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا ابراہیم بلیاوی قدس اللہ اسرارہم وغیرہ کے خاندانوں سے کوئی نسب تعلق نہیں، جس سے تقرریوں اور ترقیوں سے متعلق دارالعلوم کے مزاج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس سفر میں دارالعلوم دیوبند کے نظام سے متعلق ایک قابل صد تحسین نیا معمول میرے علم میں آیا جس نے مجھے بے حد متاثر کر دیا، اور وہ یہ کہ سابق مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۳۲ھ) نے اقربا پروری کے سد باب کے لیے اپنے دورِ اہتمام کے آخری سالوں میں یہ معمول بنایا تھا کہ دارالعلوم کے کسی استاذ محترم کے کسی فرزند ارجمند کو۔ جب تک کہ ان کے والد دارالعلوم میں تدریس سے وابستہ ہوں۔ دارالعلوم کا مدرس نہیں بنایا جائے گا۔

اس معمول سے متعلق احقر نے اطمینان حاصل کرنے کے لیے حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی موجودہ مہتمم دارالعلوم دیوبند سے ان کے دونوں نائبین کی موجودگی میں دفترِ اہتمام کے اندر جب دریافت کیا تو انہوں نے تصدیق کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ معمول حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب کے زمانے سے جاری ہے اور چونکہ سب کو اس معمول کے بارے میں علم ہے اور اس کے مطابق تعامل برقرار ہے، اس لیے اس کو چیلنج بھی نہیں کیا جاتا، ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ اس تعامل کو باضابطہ اور تحریری طور پر دستور کا حصہ نہیں بنایا گیا ہے۔

اس تعامل کا عملی مشاہدہ راقم نے اس طرح بھی کیا کہ موجودہ اساتذہ دارالعلوم دیوبند کے صاحبزادگان میں سے کسی کو دارالعلوم دیوبند کی تدریس پر فائز نہیں دیکھا، حالانکہ ان میں سے کئی صاحبزادگان کو میں بھی ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ ان میں صلاحیت و صالحیت دونوں موجود اور دارالعلوم کے مایہ ناز فضلاء میں سے ان کو شمار کیا جاسکتا ہے، مثال کے طور پر جناب مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری صاحب استاد حدیث و مفتی جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد جو جناب مولانا

قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری استاد حدیث دارالعلوم دیوبند کے صاحبزادے اور شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ کے نواسے ہیں، میں ان سے اس وقت سے واقف ہوں جب وہ دارالعلوم کے طالب علم تھے، احقر کا اس وقت مدرس کی حیثیت سے تقرر ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ امتحان میں اکثر پوزیشن لیتے تھے اور اساتذہ کرام ان کی صلاحیت و صالحیت کے قائل تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد سے لے کر آج تک ایک لائق و فائق مفتی، کامیاب مدرس اور بہترین مصنف کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں اور صلاحیتوں میں خوب اضافہ بھی ہوا ہے اور دارالعلوم دیوبند میں ایک کامیاب مدرس کی حیثیت سے کام کر سکتے ہیں، لیکن چونکہ ان کے والد محترم دارالعلوم کے مدرس ہیں، اس لیے ان کو وہاں پر تدریس کا موقع نہیں دیا جاسکتا، چنانچہ وہ ابتداء سے آج تک جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد میں مفتی و مدرس کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

اسی طرح جناب مولانا حسین احمد پالن پوری صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند جو کہ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کے صاحبزادے ہیں، ایک کامیاب مدرس و استاد حدیث، باعمل و باصلاحیت عالم دین اور ”تحفة الأملی شرح سنن الترمذی“ اور ”تحفة القاری شرح صحیح البخاری“ کے مرتب ہیں، لیکن چونکہ ان کے والد ماجد دارالعلوم کے مدرس ہیں، اس لیے نہ ان کو اور نہ ہی حضرت الاستاذ کے دوسرے صاحبزادوں میں سے کسی کو دارالعلوم میں تدریس کا موقع دیا گیا۔

ان کے علاوہ جناب مولانا سید امجد مدنی صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم کے صاحبزادے اور شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ کے پوتے ہیں، موصوف بھی ایک متقی اور باکمال مدرس اور ایک سنجیدہ علمی ذوق رکھنے والے عالم ہیں۔ علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”نخب الأفكار فی تنقیح مبانی الأخبار“ کی تحقیق میں حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب زید مجدہم کے معاون بھی رہے ہیں، لیکن ان کو بھی اس لیے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا موقع نہیں مل سکا کہ ان کے والد ماجد دارالعلوم کے مدرس ہیں۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے اس معمول کے مطابق خود عمل کیا، چنانچہ اپنے صاحبزادے جناب مولانا انوار الرحمن صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند (جن کی شرافت، تقویٰ، سنجیدگی، معاملہ فہمی اور خوش اخلاقی سے ان کا ہر جاننے والا واقف ہے) کو انہوں نے اپنے تیس سالہ دورِ اہتمام میں نہ نائب مہتمم بنایا اور نہ ہی دارالعلوم کے کسی بھی شعبہ سے وابستہ کرنے کی کوشش کی، اور مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب قدس سرہ کا یہ معمول متعارف کرانا ان کی نجات و رفع درجات کا سبب بنے گا۔ دارالعلوم دیوبند کے اس تعامل سے اگر کسی کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ اس سے دارالعلوم کو بعض باصلاحیت اور اس کے مزاج و ماحول سے واقف لوگوں کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا تو میں ان کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ صرف چند متعین اشخاص سے متعلق اور وہ بھی ایک محدود وقت کے لیے دارالعلوم کو اگر استفادہ کا موقع نہ بھی ملے تو یہ اتنا بڑا نقصان نہیں جتنا نقصان اقربا پروری کے راستے کھول دینے کی صورت میں محتمل ہے۔

بہر صورت! دارالعلوم کی بے نظیر ترقی میں احقر کی نظر میں (غور کرنے کے بعد) بنیادی کردار مذکورہ پانچ اسباب نے ادا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ دارالعلوم اور اس کی دینی خدمات کا سلسلہ تار و ز قیامت جاری و ساری رکھیں، آمین۔

دیگر مدارس کے ذمہ داران کو بھی دارالعلوم دیوبند کی پیروی کرنی

چاہیے

دارالعلوم دیوبند کو پوری دنیا میں اور بالخصوص برصغیر میں پھیلے ہوئے دینی مدارس کے ذمہ داران، اساتذہ کرام اور طلبہ اپنی مادرِ علمی تصور کرتے ہیں اور اس سے بے پناہ محبت کا اظہار کرتے ہیں، لہذا ان کو چاہیے کہ دارالعلوم سے ان کی محبت صرف زبان تک محدود نہ ہو، بلکہ اکابرین دارالعلوم کے نقش قدم پر چلنے اور ان کے طریقہ کار اور قائم کردہ اصولوں کی پیروی کو اپنا شعار بنالیں، اخلاص و تقویٰ، محنت و سادگی، باختیار شورائی نظام قائم کرنے اور صلاحیت و صالحیت کی بنیاد پر تقرریوں اور ترقیوں کا اہتمام فرمالیں۔ سہولت پسندی، نام و نمود، غیر ضروری مصروفیات اور بالخصوص اقربا پروری سے اجتناب فرمالیں۔ اس لیے کہ اس صورت میں دینی ادارے ترقی کے بجائے پیچھے کی طرف سفر کرنا شروع کرنے ملتے ہیں اور لوگوں کا اعتماد آہستہ آہستہ ختم ہونے لگتا ہے، اور ذمہ داران کو یہ بات بھی ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ مدارس کسی کی ذاتی ملکیت نہیں، بلکہ عام مسلمانوں کی امانت ہیں، جن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کر دی ہے، اور قیامت کے دن اس امانت کے ہر پہلو سے متعلق ذمہ داران حضرات کو جواب دینا ہوگا۔

گنگوہ و تھانہ بھون حاضری کی تمنا

دیوبند کے اس مختصر سفر کے دوران دل چاہ رہا تھا کہ ہمارے دوسرے علمی و دینی مراکز بالخصوص گنگوہ و تھانہ بھون حاضری کا موقع بھی مل جائے، ان علمی مراکز کی زیارت اگرچہ قیام دارالعلوم دیوبند کے زمانہ میں ہو چکی تھی، لیکن ان کی کشش و برکات اور شاندار تاریخ ہر زائر کو بار بار زیارت کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ گنگوہ جو دیوبند سے تقریباً ۴۵ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے وہ عظیم بستی ہے جو شیخ اجل حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۴۴ھ = شیخ اجل) کے زمانہ سے اولیاء اللہ و اہل علم کا مرکز رہی ہے، اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ (متوفی ۱۳۲۳ھ) نے بھی یہیں سے مسند تدریس و ارشاد کے ذریعہ دنیا کے گوشے گوشے کو بالذات یا بالواسطہ علوم نبوت کے انوار سے منور کر دیا۔ میرے استاد و مرشد فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۱۷ھ) صدر مفتی دارالعلوم دیوبند بھی اسی بستی سے تعلق رکھتے تھے۔

تھانہ بھون ایسی ممتاز ہستیوں کا مرکز رہا ہے جن کی نسبت سے اس قصبہ کو عالمی مقبولیت اور دائمی شہرت نصیب ہوئی، ان ممتاز ہستیوں میں سرفہرست سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی، حضرت حافظ محمد ضامن شہید، حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی، حضرت مولانا فتح محمد تھانوی اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

خانقاہ تھانہ بھون ابتداء حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض و برکات کا مرکز رہی، لیکن ۱۲۷۴ھ کے مشہور معرکہ شاملی میں حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ کی شہادت اور ۱۲۷۶ھ کو سید الطائفہ حضرت حاجی صاحبؒ کی مکہ مکرمہ ہجرت اور ۱۲۹۶ھ کو حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ کی رحلت کے بعد اس ”دکانِ معرفت“ کی رونق میں جب کمی نظر آنے لگی تو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ (جو مدرسہ جامع العلوم کانپور میں مدرس تھے) نے تدریس کا سلسلہ ترک کر کے اپنے شیخ عالی مقام حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی نصیحت اور اپنے استاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی تسلی و ہمت افزائی پر عمل کرتے ہوئے ۱۳۱۵ھ کو خانقاہ تھانہ بھون سے اصلاح و تزکیہ کا سلسلہ شروع فرما کر اس کی رونقوں کو نہ صرف یہ کہ بحال کر دیا، بلکہ ان میں چار چاند لگا دیئے، اور اس وقت سے اپنی زندگی کے آخری لمحہ (۱۳۶۲ھ) تک جو تقریباً نصف صدی پر محیط ہے اس خانقاہ میں تشریف فرما ہو کر وعظ و نصیحت اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ شریعت و طریقت، تزکیہ و اصلاح اعمال کے انوار پھیلاتے رہے۔ راقم عرض کرتا ہے کہ: حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی کتابوں کے مطالعہ اور اپنے اساتذہ کرام اور دیگر بزرگوں سے ان کے واقعات سننے سے مجھے بڑا فائدہ محسوس ہوا ہے، اس لیے ذاتی طور پر بھی میں ان کا بے حد معتقد و ممنون ہوں۔

بہر صورت! دلی تمنا تو یہی تھی کہ گنگوہ و تھانہ بھون دونوں مقامات کی حاضری ہو جائے، لیکن مشکل یہ درپیش تھی کہ میرے پاس ”سہارنپور“ کا ویزا تو تھا جس کی

بنیاد پر میں گنگوہ جاسکتا تھا، لیکن تھانہ بھون چونکہ ”مظفرنگر“ میں آتا ہے اور ”مظفرنگر“ کا ویزا نہیں تھا، اس لیے تھانہ بھون نہیں جاسکتا تھا، لہذا بادل ناخواستہ تھانہ بھون کا ارادہ ترک کر کے بتاریخ ۱۱/ ۷/ ۱۳۳۵ھ بروز اتوار جناب مولانا سید امجد مدنی صاحب اور دارالعلوم کے ایک طالب علم اور ایک ڈرائیور بھائی محمد یاسین صاحب کی معیت میں حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہ کی گاڑی میں گنگوہ روانہ ہوا، دیوبند سے ۴۵/ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع گنگوہ کا راستہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا، سب سے پہلے حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب کے قائم کردہ دینی ادارے ”مدرسہ مدنیہ تعلیم القرآن“ کی زیارت کی جہاں ان کے صاحبزادہ محترم جناب مولانا سید ازہر مدنی صاحب ناظم مدرسہ نے استقبال کیا اور اکرام سے بھی نوازا۔

مدرسہ مدنیہ تعلیم القرآن حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے مزار کے بالکل قریب واقع ہے۔ حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم کی دور رس اور حکیمانہ نگاہوں نے یہ محسوس کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قانع بدعت و ناشر سنت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے مزار کے ساتھ مستقبل میں جاہل عوام کی طرف سے رفتہ رفتہ بدعت کا سلسلہ شروع ہو جائے، لہذا انہوں نے مزار کے ساتھ ہی دینی مدرسہ قائم کر کے ایک طرف سے اس تاریخی بستی میں احیائے سنت کا سلسلہ برقرار رکھنے اور مزید پھیلانے کا انتظام فرمایا اور دوسری طرف حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے مزار کو محتملہ بدعات و خرافات سے بچانے کا مضبوط ذریعہ قائم کر دیا۔ جناب مولانا سید ازہر مدنی صاحب۔ جن کو

طالب علمی کے زمانہ سے میں جانتا ہوں۔ نہایت اخلاص و حکمت کے ساتھ یہاں کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی دینی محنت کو قبول فرما کر مزید استقامت و حکمت سے مالا مال فرمائے۔

مدرسہ مدنیہ تعلیم القرآن کی زیارت اور جناب مولانا سید ازہر مدنی صاحب کے ساتھ ناشتہ کرنے کے بعد حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر انوار پر حاضری دی جو بظاہر تو سادہ چبوترے پر واقع ایک کچی سی قبر ہے، لیکن زائر کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں پر انوار و برکات کی بارش برس رہی ہے، کیونکہ آپ نے پوری زندگی احیائے سنت، سرکوبی بدعت اور دین پھیلانے میں بسر کی، اور تقویٰ و طہارت، ایثار و للہیت اور صبر و تحمل کی ایسی مثالیں قائم کیں جن کی نظیریں خیر القرون کے بعد بمشکل مل سکتی ہیں۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد میرے شیخ و مرشد فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہ کے عزیزوں سے ملاقات اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی (جن کا چند روز قبل انتقال ہوا تھا) کی تعزیت کے لیے ان کی رہائش گاہ پر حاضری دی اور جناب بھائی محمد سہیل صاحب، جناب بھائی جاوید صاحب اور جناب بھائی شاہد صاحب سے ملاقات کر کے تعزیت کی اور اس موقع پر حضرت فقیہ الامت قدس سرہ کے اس مکان کی بھی زیارت کی جو انہوں نے اپنی زندگی ہی میں کسی کو ہبہ کر دیا تھا اور اپنی ملکیت میں کسی قسم کی جائیداد یا مکان یا کوئی بھی کاروبار وغیرہ باقی نہیں رکھا تھا، اور انتقال کے وقت اپنے استعمال کے کپڑوں اور سفر کے مختصر سامان کے علاوہ ان کی ملکیت میں کچھ بھی نہیں تھا۔

حضرت فقیہ الامت قدس سرہ کے رشتہ داروں سے ملاقات کے بعد حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے، جو کہ بستی کے وسط میں واقع ہے۔ یہ وہ خانقاہ ہے جو حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ویران ہو چکی تھی اور بعد میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ نے اسے آباد کر دیا اور اس میں درسِ حدیث و اصلاح و تزکیہ کا کام شروع فرمایا اور اپنی وفات تک اسی میں جلوہ افروز رہے۔ خانقاہ کی زیارت کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص کمرے اور اس میں رکھا ہوا اُن کی طرف منسوب سامان (چارپائی، تپائی، چھڑی، پان دان) کی زیارت کا موقع بھی نصیب ہوا، اور خانقاہ کے احاطے میں واقع حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت بھی حاصل کی۔ البتہ شریعت سے ناواقف لوگوں کی طرف سے ان کی قبر کی پختگی اور اس پر موجود گنبد اور بعض دیگر بدعات کی موجودگی سے دل کو بڑا دکھ بھی ہوا اور وہاں پر زیادہ دیر لگانا مناسب نہیں معلوم ہوا اور جاتے وقت یہ تصور قائم رہا کہ کاش! حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار اور اس کا ماحول بھی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اور اس کے ماحول کی طرح سنت کے مطابق ہوتا اور ان کو روحانی اذیت پہنچانے کا یہ سلسلہ نہ ہوتا۔ اس موقع پر حضرت مولانا سید ارشد مدنی زید مجدہم کے قائم کردہ ”مدرسہ مدنیہ تعلیم القرآن“ کی ضرورت اور ان کے صاحبزادے جناب مولانا سید ازہر مدنی سلمہ اللہ جو حکمت کے ساتھ محنت کر رہے ہیں اس محنت کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوا۔ گنگوہ کی اس مختصر زیارت سے فارغ ہو کر سکون و اطمینان کی کیفیت کے ساتھ ظہر سے پہلے دیوبند واپسی ہوئی۔

اکابرین دارالعلوم کی طرف سے احقر کی ہمت افزائی اور احقر کو اپنی کم مائیگی کا احساس

مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے اس مختصر قیام کے دوران اکابرین کی طرف سے احقر کی ایسی ہمت افزائی اور ذرہ نوازی کی گئی جس کا میں اپنے آپ کو ہرگز مستحق نہیں سمجھتا تھا، حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہم العالی کی طرف سے دعوت نامہ اور اس کی بنیاد پر اسپیشل ویزا ملنا، ایئر پورٹ پر احقر کے استقبال کے لیے مولانا محمد سراج صاحب کو اپنی مخصوص گاڑی سمیت بھیجنا، جمعیت کے دفتر میں احقر کا اعزاز و مہمان نوازی، دہلی سے دیوبند جانے اور واپس آنے کا انتظام، دیوبند و دہلی میں قیام کے دوران مسلسل مہمان نوازی، پھر دارالعلوم کے مہمان خانہ میں ایک وسیع و آرام دہ کمرہ میں قیام کا انتظام، اساتذہ کرام کا احقر کو دعوتوں اور ہدایا سے نوازنا، مسجد چھتہ، مسجد قدیم اور مسجد رشید میں کبھی فجر اور کبھی مغرب کی نماز کے لیے احقر کو امام بنادینا، اور جمعہ والے دن مسجد رشید میں جمعہ پڑھانے کے لیے احقر کو دفترِ اہتمام کا پیغام موصول ہونا، اور حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری شیخ الحدیث و صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم کا تحریری طور پر خصوصی اجازت نامہ حدیثِ مرحمت فرمانا (جو اس سفر کا ایک ناقابل فراموش اور سب سے اہم اعزاز ہے) ان تمام امور اور اپنی حقیقت کو سامنے رکھ کر مجھے سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۴۲۱ھ) کے غلام ”ایاز“ کا مندرجہ ذیل واقعہ یاد آیا اور اپنے آپ کو مخاطب کر کے دل میں بار بار کہا: ”ایاز! قدرِ خود را بشناس“ واقعہ کی تفصیل یہ ہے:

”ایاز سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک غلام تھا جس پر سلطان کی خصوصی نظر عنایت و شفقت تھی، دوسرے اہل دربار و مقربین اس سے حسد کرنے لگے اور ان کے خلاف کسی موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ان حاسدین نے سلطان سے عرض کیا کہ حضور! آپ اس غلام پر بڑا اعتماد اور خصوصی عنایت فرماتے ہیں، جب کہ ہمیں اس کے بارہ میں شکوک و شبہات ہیں، اس لیے کہ ہم نے بار بار دیکھا ہے کہ وہ مجلسِ شاہی کو چھوڑ کر اپنے خلوت خانہ میں جاتا ہے اور وہاں کچھ دیر ٹھہر کر باہر چلا آتا ہے، کچھ پتا نہیں کہ وہ خلوت میں کیا کرتا ہے؟ حضور کو اس کی تحقیق کر لینی چاہیے۔ سلطان کو بھی فکر لاحق ہوئی کہ واقعی تحقیق تو کر لینی چاہیے کہ وہ اس تنہائی میں کیا کرتا ہے؟ چنانچہ ایک مرتبہ ایاز اس خلوت خانہ میں جانے لگا تو سلطان بھی اس کے پیچھے تھوڑی دیر کے بعد پہنچے، دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک پرانی سی گدڑی رکھی ہوئی ہے، ایاز اس کے سامنے کھڑے ہو کر یہ جملہ بار بار دہرا رہا ہے: ”ایاز! قدرِ خود را شناس“ جب وہ اپنے اس عمل سے فارغ ہوا تو سلطان نے اس سے پوچھا کہ تم یہاں کیا کرتے ہو؟ اور اس جملہ کا مطلب کیا ہے؟ ایاز نے عرض کیا کہ میرے محسن! میں جب شروع شروع میں آپ کے دربارِ عالی میں حاضر ہوا تھا اس وقت میری کوئی حیثیت نہیں تھی اور میرے جسم پر یہی گدڑی تھی، لیکن آپ کی خصوصی عنایات نے مجھے کہاں تک پہنچا دیا؟ یہ آپ خود جانتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اس گدڑی کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی حیثیت و حقیقت کو یاد کرتا رہوں اور اپنا ماضی پیشِ نظر رہے، تاکہ دماغ خراب نہ ہو جائے اور عجب و خود فریبی میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔“

احقر نے بھی اپنی مادرِ علمی کے اندر مذکورہ اعزاز کو دیکھ کر اپنا ماضی اور اپنی حیثیت و حقیقت اور بالخصوص ایک واقعہ کو یاد کیا، واقعہ یہ تھا کہ ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء کو پڑھنے کی غرض سے جب احقر نے پہلی بار دارالعلوم دیوبند کی طرف سفر کا

آغاز کیا، اور ایک طویل و بامشقت سفر کے بعد بالآخر ایک پیسنجر ٹرین کے ذریعہ آدھی رات کو دیوبند ریلوے اسٹیشن پر بے سروسامانی کی حالت میں اُترا اور وہاں سے سائیکل رکشہ کے ذریعہ صدر گیٹ دارالعلوم دیوبند پہنچا تو دل بہت ہی خوش ہو رہا تھا کہ منزل مقصود آگئی ہے اور ارادہ یہ تھا کہ اندر جا کر مسجد دارالعلوم میں عشاء کی نماز (جو پیسنجر ٹرین میں زیادہ رش کی وجہ سے نہیں پڑھ سکا تھا) ادا کروں اور اس بات پر کہ طویل و بامشقت سفر کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی منزل مقصود تک پہنچا دیا ہے شکرانہ کی دو رکعت نماز بھی ادا کروں اور پھر صبح اپنے داخلے کی کوشش کروں، لیکن میری حیثیت یہ تھی کہ مجھے اس کا اہل بھی نہ سمجھا گیا کہ گیٹ پر مقرر دربان مجھے اندر جانے کی اجازت دے، مجھ سے پوچھنے لگے کہ کہاں سے آئے ہو؟ اور کس مقصد کے لیے اندر جانا چاہتے ہو؟ میں نے اردو زبان سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے بڑی مشکل سے ان کو یہ جواب دیا کہ ایک مسافر طالب علم ہوں، کافی دور سے دارالعلوم میں پڑھنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں، کہنے لگے کہ: پھر صبح آ جاؤ، میں نے عرض کیا کہ میں یہاں کی گلیوں سے ناواقف ہوں اور عشاء کی نماز بھی نہیں پڑھی ہے، براہ کرم! مجھے مسجد جانے کی اجازت دیجئے، بڑی مشکل سے انہوں نے اندر جانے کی اجازت دی اور گیٹ کے قریب ہی اندر کی طرف واقع ”مسجد قدیم“ کا راستہ بھی بتا دیا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد سفر کی تکان اتارنے اور تھوڑی دیر کے لیے آرام کی غرض سے لیٹنا چاہ رہا تھا، لیکن ناواقفیت کی وجہ سے کہاں جاتا اور کہاں آرام کرتا؟ مسجد کے سجدہ گاہ والے حصہ میں لیٹنا مناسب نہیں معلوم ہو رہا تھا، آخر میں مسجد کے اندر والے حصے اور صحن کے درمیان واقع سیڑھیوں کا انتخاب

کیا، اس لیے کہ یہ حصہ اگرچہ مسجد ہی کا حصہ تھا کم از کم سجدہ گاہ تو نہیں تھا، لہذا فجر کی اذان تک اپنی ایک پرانی سی صدری (گدڑی) سر کے نیچے رکھ کر انہی سیڑھیوں پر لیٹا رہا۔

بہر صورت! موجودہ سفر میں اپنی مادرِ علمی اور اساتذہ کرام و اکابر کی طرف سے احقر کی ہمت افزائی و ذرہ نوازی کو دیکھ کر اپنی گدڑی اور اپنے ماضی کو یاد کیا اور ایاز والے قصے کو اپنے اوپر منطبق پا کر ان ہی کا وظیفہ ”ایاز! قدرِ خود را بشناس“ دل میں دہراتا ہوا اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے اپنی حقیقت و ماضی کی گدڑی سے کبھی غافل نہ فرما اور خود فریبی سے محفوظ فرما۔

احقر کے پاس صرف پندرہ دن کا ویزا تھا، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ پندرہ دن چند لمحات میں گزر گئے اور بروز منگل ۲۰/۷/۱۴۳۵ھ مطابق ۲۰/۵/۲۰۱۴ء اس دعا کے ساتھ پاکستان واپسی ہوئی کہ اے اللہ! صحت و عافیت کے ساتھ بار بار مادرِ علمی اور وہاں کے بزرگوں کی زیارت کا موقع عنایت فرماتے رہیے۔ (آمین)

مرا امیدِ وصالِ تو زندہ میدارد
وگر نہ ہر دم از ہجرِ توست بیمِ ہلاک

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم، وتب علينا إنك أنت التواب الرحيم و صلى الله تعالى على سيدنا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين.

یادداشت

This image shows a single page of white paper with horizontal ruling lines. The lines are evenly spaced and run across the width of the page. There is no handwriting or other markings on the paper.

یادداشت

[illegible]

اس کتاب میں

اس سفر نامے میں بحرین شریفین اور دیگر مقامات مقدسہ کی و الہانہ
حاضری کی پُر کیف داستانِ محبت بھی ہے اور ازہر المہند "دارالعلوم دیوبند"
کے نیاز مندانہ سفر کی پُر اثر حکایتِ وفا بھی۔ بلاِ وعرب کے چند مایہ ناز
اہلِ علم و تقویٰ کے حیرت انگیز تذکرے و بصیرت افروز واقعات بھی
تلمبہ کئے گئے ہیں اور دارالعلوم دیوبند، گنگوہ اور تھانہ بھون کی چند
پرانی اور چند موجودہ عظیم شخصیات سے متعلق تاثراتی مضامین، ان کی
گراں قدر نصیحتیں اور مفید معلومات بھی۔

عقیدت و محبت کے جن جذبات کے تحت ایک سادہ انداز میں
یہ "حکایتِ بہرِ وفا" جو لکھی گئی ہے ان جذبات کی بنیاد پر یہ
امید کی جاسکتی ہے کہ وہ قاری پہلے دلچسپ اور باعثِ اطمینان و
سکون ثابت ہوگی، وما ذلک علی اللہ بعزيز۔

عنبر غزنوی عفا اللہ عنہ

۶۱۳۳۸ / ۱۰۲۹
۶۲۰۱۴ / ۴ / ۲۰

